استاد شہید مرتضیٰ مطہری

انسان اور ایمان

فتح انقلاب اسلامی کے جشن
تیسری سالگرہ کی انتظامیہ کمیٹی

نام کتاب : انسان اور ایمان

مؤلف : استاد شہید مرتضیٰ مطہری

مترجم : سید محمد عسکری

کتابت : خان زمان علوی

ناشر : وزارت ارشاد اسلامی

تعاون : فتح انقلاب اسلامی کے جشن کی تیسری سالگرہ کی انتظامیہ کمیٹی

ربیع الاول ۱۴۰۲ھ

انسان اور حیوان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان اور حیوان

انسان، حیوان ہی کی ایک قسم ہے، اسی وجہ سے وہ بہت سی چیزوں میں دوسرے جانوروں سے ملتا جلتا ہے، اس کے باوجود وہ اپنے ان ہم جنسوں سے کچھ مختلف بھی ہے۔ دوسرے جانوروں سے اس کا یہی اختلاف اسے ان سے ممتاز بنا کر اتنی فضیلت اور ارتقا عطا کرتا ہے کہ وہ لاثانی بن جاتا ہے۔

اذکار و تمایلات، دوسرے جانوروں کے مقابلے میں دو ایسے پہلو ہیں کہ جو انسان کو بنیادی

نظریہ کی وجہ سے ہے۔ وہ تربیت کی تعریف میں کہتا ہے کہ تربیت یعنی انسان کو اس کے ماحول سے سازگار کر دینا، یہ تعریف بے جان اور میکانکی ہے، اور اس کا سرچشمہ "میکانکی" فلسفہ ہے اور خلاقِ روح و ذہن اس سے نفرت کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے کالج نظری اور میکانکی علوم سے بھر گئے ہیں لیکن ادب و تاریخ و فلسفہ کے موضوعات سے کہ خود ان کے بقول یہ بے فائدہ ہیں، خالی ہو گئے ہیں..... وہ تربیت جو صرف علمی ہو اس کا نتیجہ اور ماحصل اوزار کے سوا کچھ نہ ہوگا، یہ عمل انسان کو حُسن سے بیگانہ اور حکمت سے جدا کر دیتا ہے۔ دنیا کے لئے بہتر یہ تھا کہ اسپنسر کوئی کتاب ہی نہ لکھتا۔" [1]

تعجب ہے، باوجود اس کے کہ ویل ڈورینٹ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ موجودہ خلاء سب سے پہلے "مقصد کا خلاء" ہے، مقصدوں، غایتوں اور ارمانوں کے میدان میں خلاء ہے۔ ایک ایسا خلاء ہے جو مقصدیت پسندی پر جا کر ختم ہوا ہے اور باوجودیکہ وہ تصدیق کرتا ہے کہ یہ خلاء ایک قسم کے تفکر اور انسانی اہداف و مقاصد پر ایک قسم کے ایمان کا خلاء ہے۔ وہ یہ بھی گمان کرتا ہے کہ ہر قسم کی معنویت کے ذریعے سے چاہے وہ خیالات کی دنیا سے آگے نہ بڑھتی ہو اس مرض کا علاج کیا جا سکتا ہے، وہ خیال کرتا ہے کہ تاریخ و ہنر، حسن و شعر اور موسیقی میں سرگرم ہو جانے کے ذریعہ ایک ایسے خلاء کو بھرا جا سکتا ہو جو انسان کی ارمان خواہ اور اعلیٰ مقاصد کی طلبگار فطرت کی گہرائیوں سے پیدا ہوتا ہے۔

علم اور ایمان کی جانشینی

یہ بات معلوم ہو چکی کہ علم و ایمان نہ فقط یہ کہ ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک دوسرے کے تکملہ اور متمم ہیں، اب ایک دوسرا سوال سامنے آتا ہے کہ کیا یہ دونوں ایک دوسرے کے جانشین بن

---

[1] لذاتِ فلسفہ، صفحہ ۲۰۶۔

سکتے ہیں؟ ایک دوسرے کی کمی کو پورا کر سکتے ہیں؟

ایمان اور علم کی حیثیت کو سمجھ لینے کے بعد پھر اس قسم کے سوال وجواب کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ جاتی، یہ واضح سی بات ہے کہ نہ علم ایمان کا جانشین بن سکتا ہے کہ روشنی اور توانائی کے علاوہ امید اور عشق بھی عطا کرے، ہماری خواہشات کی سطح کو ارتقاء دے اور ہم کو اپنے مقاصد واہداف تک پہنچنے اور ان مقاصد تک راستے کو طے کرنے میں ہماری مدد کرنے کے علاوہ ان مقاصد واہداف کو ہم سے چھین لے جو غریزہ اور طبیعت کے مطابق فردیت اور خود خواہی کے محور پر گھوم رہے ہیں، اور اس کے بدلے میں ہمیں ایسے اہداف ومقاصد عطا کرے جو روحانی ومعنوی تعلقات اور عشق کے محور پر چکر لگائیں۔ ہمارے ہاتھ میں اوزار کی حیثیت سے ہونے کے علاوہ ہماری ماہیت اور جوہر کو بھی بدل دے۔

اور نہ ایمان علم کا جانشین بن سکتا ہے کہ ہمیں طبیعت سے آشنا کرائے۔ ہمارے لئے اس کے قوانین پر سے پردے ہٹائے، اور ہم کو ہماری اپنی معرفت کرائے۔

تاریخی تجربے ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ علم اور ایمان کی جدائی سے انسان کو ہمیشہ ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے، ایمان کو علم کے پرتو میں پہچاننا چاہئے، ایمان علم کی روشنی میں خرافات سے محفوظ رہتا ہے، علم اگر ایمان سے جدا ہو جائے تو ایمان جمود اور اندھے تعصب کا شکار ہو جائیگا، اپنے ہی ارد گرد چکر لگاتا رہے گا، اور انسان کو کسی منزل پر نہ پہنچا سکے گا، جہاں پر عرفان وآگہی نہ ہو وہاں نادان مومنوں کا ایمان چالاک منافقوں کے ہاتھ میں کھلونا بن جائیگا، جس کے نمونے صدر اسلام کے خوارج اور اس کے بعد کے زمانوں میں مختلف شکلوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ایمان کے بغیر علم بھی، مست زنگی کے ہاتھ میں چاقو، اور آدھی رات میں چور کے ہاتھ میں چراغ کی مانند ہے جس کے ذریعے قیمتی سے قیمتی چیزوں کو چن چن کر چوری کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا بے ایمان عالم کل کے بے ایمان جاہل سے طبیعت وماہیت، رفتار وکردار کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں رکھتا، دونوں کا ٹائپ یکساں ہیں، آج کے چرچلوں، جانسنوں، اسٹالنوں اور کل کے فرعونوں، چنگیزوں،

اور اتیلاؤں کے درمیان کیا فرق ہے ؟

ممکن ہے کوئی صاحب یہ کہیں کہ کیا آپ اس بات کو نہیں مانتے کہ علم روشنی بھی ہے اور توانائی بھی ؟ علم کا روشنی اور توانائی ہونا بیرونی دنیا ہی سے مخصوص نہیں بلکہ ہماری داخلی دنیا کو بھی روشن کرتا ہے۔ ہمیں ہماری داخلی دنیا کی بھی سیر کراتا ہے اور نتیجہ میں ہم کو داخلی دنیا کی تبدیلی پر بھی قادر بناتا ہے، پس علم دنیا کو بھی تعمیر کرسکتا ہے اور انسان کو بھی سنوار سکتا ہے، پس علم اپنے کام (تعمیرِ جہان) کو بھی انجام دیتا ہے اور ایمان کے کام (تعمیرِ انسان) کو بھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی تمام باتیں صحیح ہیں لیکن بنیادی نکتہ یہ ہے کہ علم کی قدرت اور توانائی، اوزار کی قدرت اور توانائی کی مانند ہے، یعنی انسان کے حکم اور ارادہ کا تابع ہے، انسان جس میدان میں جو کام بھی انجام دینا چاہتا ہے، علم کے اوزار کے ذریعہ اس کو بخوا حسن انجام دے سکتا ہے، اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے اور ان راستوں کو طے کرنے کے لئے جن کو انسان نے اس مقصد تک پہنچنے کے لئے انتخاب کیا ہے علم انسان کا بہترین مددگار ہے۔

لیکن ہماری بحث اس موضوع پر ہے کہ انسان نے اپنے اوزار کو حرکت میں لانے سے پہلے ہی مقصد کو متعین کرلیا ہے۔ اوزار ہمیشہ مقصدوں کو حاصل کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ خود مقاصد کہاں سے پیدا ہوئے ہیں ؟ انسان کے طبعی طور پر حیوان اور اکتسابی طور پر انسان ہونے سے مراد یہ ہے کہ انسان کی انسانی استعدادوں کو ایمان کے پرتو میں آہستہ آہستہ پروان چڑھنا چاہئے، انسان اپنی طبیعت کی بناء پر اپنے طبعی، حیوانی، فردی، مادی اور خود خواہ مقاصد کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور اوزاروں کو انہی کاموں کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اسی سبب سے انسان ایک ایسی طاقت کا محتاج ہے جو انسان کا اوزار اور مقصد نہ ہو بلکہ وہ انسان کو اوزار کی مانند اپنے بنائے ہوئے راستوں کی طرف لے جائے۔ انسان ایک ایسی طاقت کا محتاج ہے جو انسان کے اندر دھماکہ کرے اور اس کی چھپی ہوئی پوشیدہ استعدادوں اور صلاحیتوں کو فعال بنائے، اس کو ایک ایسی طاقت کی ضرورت ہے جو اس کے ضمیر میں انقلاب لاکر اس کو

ایک نئی سمت اور نیا راستہ عطا کر سکے، یہ ایسا کام ہے جو علم اور انسان و جہان پر حاکم قوانین کے انکشاف کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس طرح کے اثرات اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب انسان کی روح میں بعض اقدار، مقدس اور گراں بہا ہو جائیں اور خود انسان میں کچھ بلند مرتبہ تمایلات اچھی طرح جگہ کر لیں۔ اور خود یہ تمایلات بھی اپنی جگہ پر انسان اور جہان کے بارے میں ایک مخصوص طرزِ فکر اور ایک مخصوص نظریہ کی پیداوار ہوا کرتے ہیں، پھر یہ مخصوص طرزِ فکر اور نظریہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے کتب خانوں میں ڈھونڈا جا سکے یا قیاس و استدلال کے ذریعے اس کے مفاہیم کا ادراک ممکن ہو۔ بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں ہم آئندہ صفحات میں گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کریں گے کہ یہ علم کی قلمرو سے باہر ہیں۔

ماضی اور حال کی تاریخ نے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ علم اور ایمان کے ایک دوسرے سے جدا ہو جانے کے کیا نتائج نکلتے ہیں؟ جس جگہ ایمان تھا مگر علم نہ تھا، لوگوں کی انسان دوستانہ کوششیں ایسے کاموں میں صرف ہوئی ہیں جن کا کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا، بلکہ بعض اوقات تو اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکلا ہی نہیں، اور کبھی کبھی تو یہی کوششیں جمود و خمود، تعصب اور نقصان دہ کشمکشوں کا سرچشمہ بن گئی ہیں چنانچہ انسان کے ماضی کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔

اور جہاں علم تھا لیکن ایمان کی جگہ خالی تھی جیسا کہ دورِ حاضر کے بعض معاشروں میں نمایاں ہے کہ وہاں تمام علمی طاقت خود خواہی، خود پرستی، افراط طلبی، ریاست طلبی، مکاری، دھوکہ بازی نیز لوگوں کا استحصال کرنے اور انہیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی مذموم کوششوں میں صرف کی جاتی رہی۔

گزشتہ دو تین صدیوں کو علم کی پوجا اور ایمان سے نفرت کا دور کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس دور میں بہت سے دانشور اس بات کے معتقد ہو گئے تھے کہ انسان کی ان تمام مشکلوں اور اس کی الجھی ہوئی گتھیوں کو علم کی انگلیوں کے ذریعے سلجھایا جا سکتا ہے لیکن تجربہ نے اس بات کو غلط ثابت کر دیا۔ اس دور میں کوئی ایسا مفکر نہیں ملے گا جو اس بات سے انکار کرتا ہو کہ انسان کے

نے ایک قسم کے ایمان کی ضرورت ہے، چاہے وہ ایمان بے دینی ہی کیوں نہ ہو، لیکن بہر حال ایک ایسی چیز ہے جو علم کے ماوراء ہے۔ برٹرنڈ رسل مادی رجحانات کا حامل ہونے کے باوجود اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ:

"جس کام کا مقصد صرف آمدنی ہو اس سے کوئی مفید نتیجہ ہاتھ نہ آئیگا۔ مفید نتیجہ حاصل کرنے کے لئے ایک ایسا کام اپنانے کی ضرورت ہے جس میں کسی شخص، کسی مقصد، کسی مرام اور کسی غایت پر ایمان موجود ہو۔" [1]

آج مادہ پرست حضرات یہ بھی دعویٰ کرنے کے لئے مجبور ہیں کہ ہم فلسفی اعتبار سے مادہ پرست اور اخلاقی لحاظ سے آئیڈیلیسٹ ہیں یعنی نظری لحاظ سے مادی ہیں لیکن عملی اعتبار سے امعانی اور معنوی روحانی ہیں۔ [2] لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان نظریہ کے اعتبار سے مادی ہو لیکن عملاً معنوی ہو؟ اور یہ ایک ایسا مشکل سوال ہے کہ جس کا جواب خود مادہ پرستوں کو دینا چاہئے۔

عالمی شہرت رکھنے والا دانشور، اور مشہور کتاب "تاریخِ علم" کا مصنف جارج سارٹن اپنی کتاب "شش بال" میں انسان کے تعلقات اور روابط کو انسانی بنانے میں علم کی ناتوانی و عاجزی اور ایمانی طاقت کی طرف انسان کی فوری ضرورت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"علم نے بعض میدانوں میں بہت ہی عظیم اور تعجب خیز ترقیاں کی ہیں، لیکن دوسرے میدانوں میں مثلاً قومی یا بین الاقوامی سیاست جن کا تعلق انسان کے باہمی روابط و تعلقات سے ہے آج بھی ہم کو دھوکا دے رہے ہیں۔" [3]

---

[1] برٹرینڈ رسل۔ کتاب زناشوئی واخلاق۔

[2] جارج پولیسٹر۔ کتاب اصول مقدماتی فلسفہ [3] جارج سارٹن کتاب شش بال۔

جارج سارٹن اعتراف کرتا ہے کہ انسان جس ایمان کا محتاج ہے وہ دینی اور مذہبی ایمان ہے۔ وہ انسان کے لئے ہنر، دین اور علم کے مثلث کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :۔

"ہنر حسن کو آشکار کرتا ہے، اور یہی چیز زندگی کی خوشیوں کا سبب بنتی ہے۔ دین محبت پیدا کرتا ہے اور زندگی کی موسیقی ہے، علم حق و صداقت و عقل سے سروکار رکھتا ہے اور انسانوں کی ہوشیاری کا سبب بنتا ہے، ہمیں ان تینوں کی ضرورت ہے، ہنر کی بھی، دین کی بھی اور علم کی بھی، علم بطور مطلق زندگی کے لئے ضروری ہے، لیکن تنہا علم کافی نہیں ہے۔" [1]

مذہبی ایمان

گزشتہ گفتگو سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ انسان ایمان، ارمان اور عقیدہ کے بغیر نہ تو سالم اور مطمئن زندگی بسر کر سکتا ہے اور نہ ہی بشریت اور بشری تہذیب کے لئے کوئی مفید اور ثمر بخش کام انجام دے سکتا ہے، وہ انسان جو ہر قسم کے ایمان اور عقیدے سے محروم ہو یا تو وہ ایسا موجود بن جائیگا جو خود خواہی میں اس قدر غرق ہے کہ وہ اپنے شخصی مفادات کے خول سے کبھی بھی باہر نہ نکلے، یا ایک ایسا سرگردان اور شک و تردید میں گرفتار وجود بن جائیگا جو زندگی میں اخلاقی اور معاشرتی مسائل میں اپنے فرائض کو جانتا ہی نہیں، انسان ہمیشہ اخلاقی اور معاشرتی مسائل سے دوچار ہوا کرتا ہے اور مجبور ہے کہ اس قسم کے مسائل کے مقابلہ میں ایک مخصوص ردّ عمل کا اظہار کرے، انسان اگر کسی مکتب، عقیدہ اور ایمان سے وابستہ ہو تو اس کے فرائض واضح ہیں، لیکن اگر کسی مذہب اور آئین نے اس کے فرائض کو معیّن نہ کیا ہو تو وہ ہمیشہ حیران و سرگردان رہے گا، کبھی اس طرف جائیگا اور کبھی اس طرف، ایک نامنظّم موجود بن جائیگا۔ جی ہاں اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ایک مکتب فکر اور ایک عقیدہ سے وابستہ ہونا ضروری ہے۔

---

[1] شش بال۔ صفحہ ۳۰۵

اب جس چیز کی طرف توجہ دینا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ صرف مذہبی ایمان ہی اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ انسان کو ایک حقیقی مومن بنا دے، خود خواہی اور خود پرستی کو ایمان و عقیدہ اور مسلک کے ذریعہ دبا بھی دے اور انسان میں کچھ اس قسم کا "تعبد" اور "تسلیم" بھی ایجاد کر دے کہ انسان مکتب کی جانب سے پیش کئے جانے والے چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ میں بھی شک و تردید نہ کرے۔ اور اس چیز کو اس حد تک گراں بہا، محبوب اور عزیز بھی بنا دے کہ اس کے بغیر انسان کے لئے زندگی بے مزہ، بے معنی اور بے مقصد ہو جائے بلکہ وہ ایک قسم کے تعصب اور غیرت کے ساتھ اس چیز کی حمایت کرے۔

مذہبی، ایمانی رجحانات اس بات کا سبب ہیں کہ انسان فردی و طبیعی رجحانات کے برخلاف کوشش کرے اور بعض اوقات اپنے ایمان کی راہ میں اپنی حیثیت اور اپنی جان کو قربان کر دے، اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے جبکہ انسان کا عقیدہ تقدس کا پہلو اختیار کرلے اور انسان کے وجود پر بطور مطلق حاکم ہو جائے اور یہ بات آشکار ہے کہ یہ صرف اور صرف مذہبی طاقت ہی ہے جو عقائد کو تقدس عطا کر سکتی ہے اور ان کے احکام کو انسان پر بھرپور طاقت کے ساتھ نافذ کر سکتی ہے۔

بعض اوقات لوگ مذہبی عقائد کے لئے نہیں بلکہ نفسیاتی الجھنوں، کینہ توزیوں، انتقامی جذبات کے دباؤ اور آخر کار ظلم و ستم، دباؤ اور گھٹن کے احساس کے مقابلہ میں ایک شدید ردِ عمل کی شکل میں فداکاری کرتے ہیں اور اپنی جان، مال، ناموس اور تمام حیثیت کو قربان کر دیتے ہیں اور اس کی مثالیں دنیا کے گوشہ و کنار میں نظر آتی ہیں۔

لیکن ایک مذہبی اور غیر مذہبی عقیدہ میں فرق یہ ہے کہ جہاں پر مذہبی عقیدہ کی بات آئے اور عقیدہ کو تقدس مل جائے تو وہاں پر انسان اپنی مرضی سے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے اور صاف سی بات ہے کہ جو کام ہنسی خوشی اپنی مرضی اور ایمان کے ماتحت انجام دیا جا سکے اس کے اور اس کام کے درمیان واضح فرق ہے جو نفسیاتی الجھنوں اور داخلی پریشان کن گھٹن سے متاثر ہو کر انجام دیا جائے کہ یہ ایک قسم کا دھماکہ ہے اور وہ انتخاب!

دوسرے یہ کہ اگر انسان کی جہان بینی یعنی کائنات کے متعلق اس کی سوچ کا انداز صرف مادّی ہو اور وہ اس بنیاد پر ہو کہ تمام واقعیات، محسوسات میں منحصر ہیں تو ہر قسم کی عقیدہ پرستی اور انسانی و معاشرتی ارمان طلبی ان محسوس واقعیات کے برخلاف ہے جن کو انسان اس وقت دنیا کے ساتھ اپنے رابطوں اور تعلقات میں محسوس کرتا ہے۔

"حسّی جہاں بینی کا نتیجہ خود پرستی ہے، نہ کہ عقیدہ پرستی۔ عقیدہ پرستی اگر ایک ایسی جہاں بینی کی بنیاد پر ہو جس کا منطقی نتیجہ عقیدہ ہے تو وہ خیال پرستی کی حدود سے آگے نہیں بڑھے گی یعنی انسان موجودہ واقعیات سے الگ تھلگ اپنے اندر اور اپنے خیال کے سہارے ایک دنیا کی تعمیر کرکے اسی میں مگن رہنے لگے گا، لیکن اگر عقیدہ پرستی کا سرچشمہ دین و مذہب ہو تو وہ ایک ایسی جہان بینی پر تکیہ کئے ہوگی جس کا منطقی نتیجہ معاشرتی ارمانوں اور عقیدوں کی پیروی ہے، مذہبی ایمان، انسان اور دنیا کے کلّی ارمانوں کے درمیان ایک قسم کی ہم آہنگی اور اتحاد ہے، لیکن غیر مذہبی ارمان اور ایمان دنیا سے ایک قسم کی لاتعلقی اور اپنے لئے ایک ایسی خیالی دنیا کی تعمیر کرنا ہے جسے بیرونی دنیا سے کسی قسم کی حمایت حاصل نہ ہو۔"

مذہبی ایمان انسان کے لئے طبعی تمایلات کے برخلاف صرف کچھ فرائض ہی متعیّن نہیں کرتا بلکہ انسان کی نظر میں دنیا کے چہرے کو بدل دیتا ہے، دنیا کی عمارت میں، محسوس عناصر کے علاوہ کچھ اور عناصر سے بھی آشنا کراتا ہے۔ وہ خشک، سرد، میکانکی اور مادی دنیا کو جاندار اور ذی شعور دنیا میں بدل دیتا ہے۔ مذہبی ایمان دنیا اور تخلیق کے بارے میں انسان کے خیالات بدل دیتا ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور کا امریکی ماہر نفسیات اور فلسفی ولیم جیمز کہتا ہے:-

"مذہبی فکر ہمیں جو دنیا عطا کرتی ہے وہ اس دنیا کی تمام چیزوں کی حامل تو ہوتی ہی ہے جو ایک مادی فکر کے انسان کے پاس موجود ہوتی ہے، پھر اس میں بہت سی ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جو مادی فکر کے انسان کی دنیا میں ہرگز دستیاب نہیں ہو سکتیں۔"[1]

---

[1] ولیم جیمز "دین و روان"۔

ان باتوں کے علاوہ مقدس اور قابل پرستش واقعیات اور حقائق کی طرف رجحان ہر انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ انسان کچھ ایسے رجحانات اور غیر مادی قوتوں اور استعدادوں کا خزانہ ہے جو پروان چڑھنے کے لئے آمادہ ہیں۔ انسان میں صرف مادی رجحانات ہی نہیں پائے جاتے ہیں اور اس کے روحانی رجحانات صرف تلقینی اور اکتسابی ہی نہیں ہیں بلکہ یہ ایسے حقائق ہیں کہ علم بھی انکی تائید کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ولیم جیمز کہتا ہے :-

"خواہ ہماری بہت سی خواہشات اور رجحانات کے محرک اور علت کا سرچشمہ یہی دنیا ہو لیکن ہماری اکثر و بیشتر آرزوؤں اور رجحانوں کا سرچشمہ وہ دنیا ہے جو ماوراءالطبیعت میں ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی اکثر آرزوئیں مادی حساب و کتاب کے برخلاف ہیں"۔ ؎[1]

چونکہ انسان میں یہ خواہشات موجود ہیں اس لئے ان کی تربیت کی ضرورت ہے۔ اگر ان کی صحیح تربیت نہ کی جائے اور ان سے صحیح فائدہ نہ اٹھایا جائے تو وہ برے اور انحرافی راستوں پر لگ کر انسان کو اس قدر نقصان پہنچائیں گی جس کا تصور بھی محال ہے جیسا کہ بت پرستی، انسان پرستی، طبیعت پرستی، اور ہزاروں قسم کی دوسری پوجائیں یہ سب اسی انحراف اور غلط تربیت کا نتیجہ ہیں۔ اریک فروم کہتا ہے :-

"کوئی شخص ایسا نہیں جو کسی دین کا محتاج نہ ہو، اور سمت معین کرنے کے لئے کچھ حدود اور اپنی وابستگی و لگاؤ کے لئے کوئی موضوع نہ چاہتا ہو، ممکن ہے کہ وہ خود اپنے ان مجموعی عقائد سے آگاہ نہ ہو جو دین کے عنوان سے ہیں اور لادینی عقائد سے ممتاز ہیں اور ممکن ہے کہ اس کے برعکس وہ سوچتا ہو کہ وہ کسی دین کو نہیں مانتا، چنانچہ وہ اقتدار، دولت اور کامیابی جیسے بظاہر لادینی مقاصد کے ساتھ اپنے لگاؤ کو صرف عملی معاملات یا مصلحت کے مطابق امور سے اپنی دلچسپی پر محمول کرتا ہو لیکن دراصل یہ مسئلہ تو سرے سے ہے ہی نہیں کہ انسان کسی دین کو مانتا ہے یا نہیں، بلکہ بحث یہ ہے انسان کس

؎[1] ولیم جیمز "دین و روان"

دین کو تسلیم کرتا ہے"۔ [1]

اس ماہرِ نفسیات کا مقصد یہ ہے کہ انسان تقدس اور عبادت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، بالفرض اگر وہ خدائے واحد کو نہ مانے اور اس کی عبادت نہ کرے تو وہ یقیناً کسی اور چیز کو حقیقت برتر کے عنوان سے تسلیم کرکے اس کو اپنے ایمان و عبادت و پوجا کا موضوع بنائے گا۔

پس چونکہ انسان کے لئے کسی عقیدہ، ارمان اور ایمان کی ضرورت ہے اور ایک طرف سے صرف مذہبی ایمان ہی ایسا ایمان ہے جو انسان کو واقعی طور پر اپنے زیرِ اثر رکھ سکتا ہے اور دوسری طرف سے اپنی فطرت کی پکار سے مجبور ہو کر کسی ایسی چیز کی جستجو میں ہے جس کو تقدس اور احترام کی نگاہوں سے دیکھے اور اس کی پوجا کرے لہٰذا نجات کا صرف یہی ایک راستہ ہے کہ ہم اپنے مذہبی ایمان کو مستحکم بنائیں۔

قرآنِ حکیم سب سے پہلی کتاب ہے جس نے اولاً پوری صراحت کے ساتھ اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ مذہبی ایمان، نظامِ تخلیق کے ساتھ ایک طرح کی یگانگت و اتحاد رکھتا ہے۔

"اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ [2]

کیا خدا کے دین کے علاوہ کسی دوسری چیز کی جستجو کرتے ہیں، حالانکہ زمین و آسمان کے تمام باشندے اس کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔

اور ثانیاً مذہبی ایمان کو انسانوں کی فطرت کا جزء بتاتا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا۔ [3]

---

[1] ایک فردم۔ "رو انکا ولی واین"

[2] سورۃ آل عمران۔ آیت ۸۳۔

[3] سورۃ الروم۔ آیت ۳۰۔

حق پسندی کے ساتھ اپنے چہرے کو دین کی طرف پھیر دو، وہی جو خدائی فطرت ہے جس سے اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

ایمان کے آثار اور فائدے

اگرچہ اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے مذہبی ایمان کے اثرات واضح ہو چکے ہیں لیکن زندگی کے اس گرانبہا سرمایہ اور اس معنوی دولت کے مفید اثرات سے اچھی طرح سے آشنا ہونے کے لئے اس بحث کو بطورِ مستقل اور جدا بیان کرنا بہتر سمجھتا ہوں۔

روسی مصنف و مفکر ٹالسٹائی کہتا ہے:

"ایمان ہی وہ چیز ہے جس کے سہارے عوام زندہ ہیں۔"

حکیم ناصر خسرو علوی اپنے فرزند کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:-

"ز دنیا روی زی دین کردم ایرا — مرا بی دین، جہاں چہ بود زندان
مرا پورا زدین ملکی است در دل — کہ آن ہرگز نخواہد گشت ویران" [1]

انسانی زندگی میں خوشی اور مسرت پیدا کرنے، معاشرتی تعلقات و روابط کو بہتر بنانے اور کائنات کے نظام کی لازمی پریشانیوں کو دور کرنے کے سلسلے میں مذہبی ایمان کے اثرات بہت زیادہ ہیں آئندہ صفحات میں ہم ان تینوں شعبوں میں مذہبی ایمان کے اثرات کا جائزہ لیں گے۔

(ا) خوشی و مسرت

انسان زندگی میں خوشی اور مسرت پیدا کرنے کے سلسلے میں مذہبی ایمان کا پہلا اثر "حسنِ ظن"

---

[1] میں دنیا سے دین کی طرف اس لئے پلٹ آیا ہوں کہ۔ دین کے بغیر یہ کائنات میرے لئے کنواں اور جیل ہے میرے فرزند! دین دل میں ایک ایسی دولت اور بادشاہی ہے۔ جس کو کبھی زوال نہ آئے گا۔

ہے۔ دنیا اور تخلیق کائنات کے بارے میں حسن ظن، مذہبی ایمان، دنیا کے بارے میں انسان کے نظریہ کو ایک مخصوص روپ دیتا ہے کیونکہ وہ خلقت کو بامقصد بتاتا ہے اور اس کے مقصد کو خیر، ارتقاء اور سعادت بیان کرتا ہے، لہٰذا فطری طور پر انسان کو کائنات کے کلّی نظام اور اس پر حاکم قوانین کے سلسلے میں پر امید اور خوش بین بنا دیتا ہے، اس وجودی ملک میں رہنے والے باایمان شخص کی حالت اس شخص کی مانند ہے جو کسی ایسے ملک میں رہتا ہو جس کے انتظامات اور قوانین کو وہ صحیح اور منصفانہ بھی سمجھتا ہو، اور وہ اس ملک کے اصلی حکمرانوں کی حسن نیّت پر ایمان بھی رکھتا ہو، اس لئے وہ فطری طور پر یہاں اپنے اور دوسرے تمام لوگوں کی ترقی و ارتقاء کے لئے زمین ہموار سمجھتا ہو گا۔ اس کے عقیدے کے مطابق صرف ایک چیز ہے جو ممکن ہے پسماندگی کا سبب بن جائے اور وہ خود اس کی اور اس جیسے دوسرے انسانوں کی کاہلی اور ناتجربہ کاری ہے، جو مکلّف اور ذمّہ دار ہیں۔

ایک ایسا شخص اپنی نظر میں خود ہی اپنی پسماندگی کا ذمہ دار ہوتا ہے، نہ کہ ملک کی انتظامیہ اور ملک میں جو بھی عیب پایا جاتا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ اس نے اور اس جیسے لوگوں نے اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا ہے، چنانچہ یہ فکر فطری طور پر اس کو غیرت دلاتی ہے اور حسن ظن اور امیدواری کے سایہ میں اس کو متحرک و فعّال بنا دیتی ہے۔

لیکن وجود کی مملکت میں ایک کافر شخص اس شخص کے مانند ہے جو ایک ایسے ملک میں رہتا ہو جہاں کی انتظامیہ، اداروں اور قوانین کو وہ فاسد اور غیر منصفانہ سمجھتا ہو، لیکن وہ اس کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور بھی ہو، ایسے شخص کا دل ہمیشہ کینہ اور نفرت سے بھرا رہتا ہے، وہ کبھی بھی اپنی اصلاح کے بارے میں نہیں سوچتا بلکہ اس کو سوچ تو یہ ہوتی ہے کہ زمین و آسمان نامنظّم ہیں، پوری دنیا ظلم و جور و بدکاری سے بھری ہوئی ہے، مجھ جیسے ایک چھوٹے سے ذرّے کے سدھر جانے سے کیا فائدہ ہوگا ایسا شخص کبھی بھی اس دنیا سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا، دنیا اس کے لئے ہمیشہ ایک ہولناک اور مہیب جیل کی مانند ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا۔ [1]

جو شخص میری یاد سے غفلت اور روگردانی کرے گا اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی، جی ہاں!

یہ ایمان ہی ہے جو ہماری زندگی کو خود ہمارے ہی وجود میں وسعت دیتا ہے، اور اس سلسلہ میں نفسیاتی دباؤ اور الجھنوں کو ختم کر دیتا ہے۔

خوشی و مسرت کی ایجاد کے لحاظ سے مذہبی ایمان کا دوسرا اثر "روشن دلی" ہے۔ انسان جب مذہبی ایمان کی بنیاد پر دنیا کو حق و حقیقت کے نور سے روشن دیکھتا ہے تو یہ روشن بینی اس کی روح کی فضا کو بھی پر نور بنا دیتی ہے اور اس چراغ کی مانند ہو جاتی ہے جو وجود کی گہرائیوں میں روشن ہو، اس کے برخلاف جو شخص ایمان کی دولت سے محروم ہو اس کی نظر میں دنیا بے مقصد، تاریک نیز فکر و ادراک و روشنی سے خالی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس تاریک خانہ میں جس کو خود اس نے فرض کیا ہے اس کے دل کا کاشانہ بھی اندھیرا اور تاریک رہتا ہے۔

خوشی و مسرت کی ایجاد کے لحاظ سے مذہبی ایمان کا تیسرا اثر یہ ہے کہ انسان کو یہ امید دلاتا ہے کہ اچھی محنت اور کوشش کا نتیجہ اچھا ہوا کرتا ہے۔

مادی منطق کے نقطۂ نظر سے دنیا کو ان لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے جو حق یا باطل، عدل یا ظلم، اچھائی یا برائی کے لئے کوشش کرتے ہیں، ان کی نظر میں ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ محنت کا نتیجہ صرف "محنت اور کوشش کی مقدار" سے وابستہ ہے۔ اور بس۔

لیکن ایک مومن شخص کے نزدیک دنیا ان دو گروہوں کی محنتوں اور کوششوں کو ایک نظر سے نہیں دیکھتی، ان دو قسم کی محنتوں اور کوششوں کے مقابلہ میں دنیا کا ردِ عمل یکساں نہیں ہے بلکہ نظام خلقت ان لوگوں کی حمایت کرتا ہے جو حق و حقیقت، اچھائی اور عدالت و خیر خواہی کے

---

[1] طٰہٰ: ۱۲۴

لئے کوشش کرتے ہیں، اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ۔ اگر تم خدا کی مدد کرو گے (حق کی راہ میں قدم بڑھاؤ گے) تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔[1] اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ نیک کام کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہ ہو گا۔[2]

خوشی و مسرت کے نقطۂ نظر سے مذہبی ایمان کا چوتھا اثر، سکونِ قلب ہے، انسان فطری طور پر اپنی سعادت اور خوش نصیبی کی تلاش میں ہے، سعادت اور خوش نصیبی کو حاصل کر لینے کے تصور سے ہی خوشی و مسرت میں غرق ہو جاتا ہے اور بدنصیبی کے بھیانک مستقبل کو سوچ کر ہی اس کا بدن لرزنے لگتا ہے اور سخت تشویش و اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نیز دو چیزیں انسان کی سعادت اور خوش نصیبی کا سبب بنتی ہیں :۔

۱۔ کوشش۔

۲۔ ماحول کے حالات سے اطمینان۔

ایک طالب علم کی کامیابی دو چیزوں کا نتیجہ ہے۔ ایک خود اس کی محنت اور کوشش، دوسرے سکول کے ماحول کی آمادگی اور سازگاری اور پڑھائی کے سلسلہ میں سکول کے منتظمین کی تشویق، ایک محنتی طالب علم اگر اس ماحول میں جس میں وہ پڑھ رہا ہے اور اس ماسٹر پر جو اس کو سالانہ امتحان میں نمبر دیتا ہے، اعتماد نہ رکھتا ہو، اور ان کے سلوک کو ایک غیر منصفانہ سلوک سمجھتا ہو تو وہ ہمیشہ مضطرب اور پریشان ہی رہے گا اور کچھ نہ سیکھ سکے گا۔

اپنے سلسلہ میں انسان جو کچھ انجام دیتا ہے وہ اسے معلوم ہوتا ہے اسلئے اس سلسلہ میں اس کو کسی قسم کی تشویش لاحق نہیں ہوتی، کیونکہ اضطراب اور تشویش، شک و تردید کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

---

[1] محمدؐ: ۷۔

[2] توبہ ۱۲۰، ہود ۱۱۵، یوسف ۹۰۔

جس چیز کا تعلق خود اپنی ذات سے ہے انسان اس کے بارے میں شک و تردید نہیں کرتا، یہ دنیا ہے جو انسان کو اضطراب اور تشویش میں مبتلا کر دیتی ہے کیونکہ اسے معلوم نہیں ہوتا کہ اس سلسلے میں اس کا فریضہ کیا ہے۔

کیا اچھا کام مفید ہے؟ کیا صداقت و امانت فضول چیز ہے؟ کیا تمام کوششوں محنتوں اور فرائض کی انجام دہی کا نتیجہ محرومیت ہے؟ ان سوالوں کے جواب کا وقت ہی وہ وقت ہوتا ہے جب اضطراب اور تشویش انتہائی بھیانک روپ میں سامنے آجاتی ہے۔

چونکہ مذہبی ایمان انسان کو جو کہ اس معاملہ کی ایک فرد ہے، دنیا کے بارے میں جو کہ اس معاملہ کی دوسری فرد ہے، اعتماد اور اطمینان دلاتا ہے، لہٰذا انسان کے سلسلے میں دنیا کے سلوک کے بارے میں اضطراب و تشویش کو ختم کر کے اس کو سکونِ قلب عطا کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ مذہبی ایمان کا ایک اثر سکونِ قلب بھی ہے۔

خوشی و مسرت پیدا ہونے کے نقطۂ نظر سے مذہبی ایمان کا ایک دوسرا اثر یہ ہے کہ وہ انسان کو کچھ ایسی لذتوں سے بہرہ مند کرتا ہے جس کو روحانی لذتوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کیونکہ انسان دو طرح کی لذتوں سے بہرہ مند ہوتا ہے، لذتوں کی ایک قسم وہ ہے جو انسان کی کسی ایک حس سے تعلق رکھتی ہے کہ یہ اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کسی بیرونی مادے سے کسی عضو کا رابطہ برقرار ہو جائے جیسے وہ لذت جو آنکھ کو دیکھنے، کان کو سننے، زبان کو چکھنے اور ہاتھ وغیرہ کو چھونے کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اور لذتوں کی دوسری قسم وہ لذتیں ہیں جو انسان کی روح اور ضمیر کی گہرائیوں سے تعلق رکھتی ہیں اور وہ کسی خاص عضو سے متعلق نہیں ہیں اور نہ ہی کسی بیرونی مادے سے رابطہ برقرار ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہیں، جیسے وہ لذت جو انسان کو احسان و خدمت یا محبوبیت و احترام، اپنی کامیابی یا اپنی اولاد کی کامیابی سے حاصل ہوتی ہے کہ نہ تو اس کا کسی خاص عضو سے تعلق ہے اور نہ کسی بیرونی مادی چیز کے براہ راست ماتحت ہیں۔

روحانی لذتیں، مادی لذتوں سے زیادہ طاقتور بھی ہیں اور زیادہ دیرپا بھی، حق پرست عارفوں

کو خداوند عالم کی عبادت سے اسی قسم کی لذت ملتی ہے، وہ عارف و عبادت گزار جو حضورِ قلب، خلوصِ نیت، خضوع و خشوع اور استغراق کے عالم میں عبادت کرتے ہیں وہ سب سے زیادہ عبادت ہی سے لطف اندوز ہوتے ہیں، دین کی زبان میں اس کو "لذتِ ایمان" اور "حلاوت ایمان" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ ایمان میں ایک ایسی مٹھاس اور حلاوت پائی جاتی ہے جو تمام حلاوتوں سے بہتر ہے، معنوی لذتیں اس وقت دوگنی ہو جاتی ہیں جبکہ کسبِ علم، احسان، خدمت اور کامیابی جیسے امور کا سرچشمہ دینی احساسات ہوں اور انہیں اللہ کے لئے انجام دیا جائے اور یہ عبادت کی قلمرو میں داخل ہو جائیں۔

(ب) معاشرتی رابطوں کو بہتر بنانے میں ایمان کا کردار

انسان بعض دوسرے جانداروں کی طرح معاشرت پسند پیدا کیا گیا ہے، فرد اکیلے ہی اپنی ضروریات پوری کرنے کی توانائی نہیں رکھتا، اس کے لئے ضروری ہے کہ زندگی ایک کمپنی کا روپ اختیار کرلے، ہر شخص فرائض اور فائدے میں شریک ہو اور لوگوں کے درمیان ایک طرح کی "تقسیم کار" ہو جائے، لیکن انسان اور شہد کی مکھی جیسے دوسرے سماجی جانداروں کے درمیان فرق یہ ہے کہ ان جان داروں میں کام اور فرائض کی تقسیم، غریزہ اور طبیعت کے احکام کے ماتحت ہے اور ہر قسم کی سوچ بچار و مخالفت کا حق ان سے چھین لیا گیا ہے لیکن اس کے برخلاف انسان ایک آزاد اور خود مختار موجود ہے۔ اس کو اپنے کام کو آزادی کے ساتھ اور "وظیفہ" و "فریضہ" سمجھ کر انجام دینا چاہئے اور بالفاظ دیگر دوسرے جانداروں کی ضروریات سماجی ہیں اور معاشرتی غرائز بھی جبری طریقے سے ان پر حاکم ہیں لیکن انسان کی ضروریات بھی اگرچہ سماجی ہیں مگر اس پر اس قسم کے غرائز کی حکمرانی نہیں، انسان کے معاشرتی غرائز کچھ "خواہشات" اور "مانگ" کی شکل میں انسان کے باطن میں موجود ہیں جن کو تعلیم و تربیت کے سایہ میں پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔

صحیح و سالم معاشرتی زندگی یہ ہے کہ افراد ایک دوسرے کے حقوق اور قوانین کا احترام کریں۔ عدل کو ایک مقدس چیز سمجھیں، ایک دوسرے کے ساتھ محبت کریں، ہر شخص دوسروں کے لئے اسی چیز کو پسند کرے جو خود اپنے لئے پسند کرتا ہے، اور جو چیز اپنے لئے بری سمجھتا ہے اس کو دوسروں کے لئے بھی برا سمجھے۔ لوگ آپس میں ایک دوسرے پر اعتماد اور اطمینان رکھتے ہوں۔ ان کی روحانی اور نفسیاتی کیفیات ان کے متقابل اعتماد کی ضامن ہوں، ہر شخص خود کو اپنے معاشرہ کی ذمہ دار فرد سمجھتا ہو، مخفی سے مخفی جگہ پر ان کے تقویٰ اور پرہیزگاری کا وہی عالم ہو جیسا کہ بھرے مجمع میں ہوتا ہے۔ کسی لالچ کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کریں، ظلم و ستم کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوں، ظالم و ستمگر اور حاسد عناصر کو ظلم و ستم اور فساد کرنے کی مہلت نہ دیں، اخلاقی اقدار کا احترام کریں، آپس میں ایک ہی جسم کے اعضاء کی طرح سے متحد اور متفق ہوں۔

تقویٰ اور پرہیزگاری ہی وہ قوت ہے جو حق کو محترم، عدالت کو مقدس، دلوں کو آپس میں مہربان اور لوگوں کے درمیان متقابل اعتماد برقرار کرنے کے سلسلے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، جو چیز ان باتوں کو انسان کے ضمیر کی گہرائیوں میں راسخ کر دیتی ہے، اس کے نزدیک اخلاقی اقدار کو معتبر بناتی، اس میں ظلم و ستم سے ٹکر لینے کے لئے شجاعت پیدا کرتی اور تمام انسانوں کو آپس میں ایک جسم کے اعضاء کی طرح متحد کرتی ہے، وہ مذہبی ایمان ہے۔

انسانوں کو وہ انسانی تجلیاں جو حادثات سے بھری ہوئی انسانی تاریخ کے آسمان پر ستاروں کی مانند چمک رہی ہیں، اور یہ تجلیاں وہ ہیں جن کا سرچشمہ مذہبی احساسات ہیں۔

(ج) پریشانیوں میں کمی۔

انسان کی زندگی میں جس طرح سے خوشیوں، کامیابیوں اور مقاصد کے حاصل ہو جانے کا وجود ہے، اسی طرح سے رنج و الم، مصیبتیں، شکستیں، ناکامیاں، تلخیاں اور فرصت کا ہاتھ سے نکل جانا

بھی ہے، ان میں بہت سی چیزوں کی روک تھام بھی ممکن ہے اور ان کو برطرف بھی کیا جا سکتا ہے اگرچہ اس کے لئے بہت زیادہ محنت و کوشش کی ضرورت ہو، یہ واضح سی بات ہے کہ انسان کا فریضہ ہے کہ وہ طبیعت کا مقابلہ کرے، تلخیوں کو حلاوتوں سے بدل دے، لیکن کائنات کے بعض حوادث ایسے ہیں جن کی روک تھام کرنا یا ان کو برطرف کرنا ممکن نہیں جیسے بڑھاپا، انسان خواہ مخواہ بڑھاپے کی جانب بڑھتا جاتا ہے اور اس کی زندگی کا چراغ گل ہونے کے قریب آجاتا ہے۔ بڑھاپے کی کمزوری و ناتوانی اور اس کے تمام عارضے زندگی کے چہرے کو افسردہ بنا دیتے ہیں اور اس کی موت و فناء، اس کی کائنات سے آنکھ بند ہو جانے، اس دنیا سے چلے جاتے اور اس کو دوسرے کے حوالے کر دینے کی فکر انسان کو دکھ پہنچاتی ہے۔

مذہبی ایمان انسان میں مقابلہ اور مقاومت کی طاقت پیدا کرتا ہے، تلخیوں کو حلاوت سے بدل دیتا ہے۔ مومن انسان یہ جانتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز کے لئے ایک حساب معین ہے۔ اور اگر تلخیوں کے مقابلے میں اس کا ردِ عمل صحیح ہو تو اگر بالفرض یہ خود تلافی کے قابل نہ ہوں تو خداوند عالم کسی اور طریقہ سے اس نقصان کو پورا کر دے گا، چونکہ بڑھاپا فنا نہیں ہے اور اس کے علاوہ مومن شخص ہمیشہ اپنے فراغت کے اوقات کو عبادت اور خدا کے ذکر سے انس کے ذریعے گزار لیتا ہے لہٰذا وہ بڑھاپا اس حد تک دلپسند اور محبوب ہو جاتا ہے کہ خدا پرستوں کے لئے بڑھاپے کے زمانہ میں زندگی کی لذّت جوانی سے کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ ایک مومن کی نظر میں موت کا چہرہ اس چہرہ سے مختلف ہوتا ہے جو کافر کو نظر آتا ہے۔ مومن کی نظر میں موت فنا و نابودی نہیں، بلکہ فانی دنیا سے باقی اور جاوید دنیا کی جانب سفر ہے۔ چھوٹی دنیا سے بڑی دنیا کی جانب کوچ ہے۔ موت، عمل اور کھیتی کی دنیا سے نتیجے اور جزا کی دنیا میں منتقل ہونا ہے، لہٰذا مومن افراد نیک کاموں میں جس کو دین کی زبان میں "عمل صالح" کہا جاتا ہے کوشش و محنت کر کے موت کے سلسلہ میں اپنے خوف اور اضطراب کو برطرف کر لیتے ہیں۔

سماجیات کے ماہرین کی نظر میں یہ بات مسلم ہے اور یقینی ہے کہ وہ نفسیاتی بیماریاں جو

روح کی پریشانیوں والجھنوں اور زندگی کی تلخیوں کی پیداوار ہیں زیادہ تر غیر مذہبی لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ مذہبی افراد کا ایمان جتنا قوی اور مستحکم ہوتا ہے وہ ان بیماریوں سے اسی قدر محفوظ رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس دور کی زندگی میں ایمان کے کمزور ہونے کی وجہ سے جو عارضے پیدا ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہی اعصابی ونفسیاتی بیماریوں اور بیماروں کی تعداد میں اضافہ ہے۔

مکتبہ، آئیڈیالوجی، نظریہ

مکتب ، آئیڈیالوجی ، نظریہ

مکتب یا آئیڈیالوجی کیا چیز ہے، اور اس کی تعریف کیا ہے؟ کیا ضرورت ہے کہ انسان ایک فرد یا معاشرہ کے ایک عضو کی حیثیت سے ایک مکتب کا پیرو ہو اور ایک آئیڈیالوجی سے وابستہ ہو جائے اور اس پر ایمان رکھتا ہو؟ کیا فرد یا معاشرہ کے لئے ایک آئیڈیالوجی کا ہونا ضروری ہے؟ یہ ایسے سوال ہیں جن کا جواب انسانی زندگی میں اہمیت کا حامل ہے لیکن ان کے جواب سے پہلے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے۔

انسان کی کوششیں دو طرح کی ہوتی ہیں: (۱) التذاذی اور (۲) تدبیری۔ التذاذی کوششیں وہی سادہ اور معمولی کوششیں ہیں جن کو انسان کسی قسم کی لذّت حاصل کرنے اور یا کسی رنج و غم سے چھٹکارا پانے کے لئے غریزہ و طبیعت یا عادت سے جو طبیعت ثانوی کہلاتی ہے براہِ راست متأثر ہو کر انجام دیتا ہے مثلاً جب اس کو پیاس لگتی ہے تو وہ پانی سے بھرے ہوئے برتن کی طرف ہاتھ بڑھا دیتا ہے، کسی ڈسنے والے جانور کو دیکھتا ہے تو وہاں سے بھاگ جاتا ہے، سگریٹ کی بہت شدّت کے ساتھ طلب محسوس ہوتی ہے تو سگریٹ سلگا لیتا ہے۔

اس طرح کے کام خواہشات کے مطابق ہیں اور براہِ راست لذّت و رنج سے سروکار رکھتے ہیں، لذّت بخش کام ایک قسم کی کشش اور جاذبہ کے ذریعہ انسان کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے، اور تکلیف دہ کام ایک قسم کے دافعہ کے ذریعہ انسان کو اپنے سے دور کر دیتا ہے۔

تدبیری کوششیں اور فعالیتیں وہ کام ہیں جن میں بذاتِ خود کسی قسم کا جاذبہ یا دافعہ نہیں پایا جاتا، غریزہ و طبیعت انسان کو نہ ان کاموں کی طرف رغبت دلاتی ہے اور نہ ہی ان سے دور کرتی

ہے بلکہ انسان عقل اور ارادہ کے حکم سے اس مصلحت کی خاطر جو اس کام کو انجام دینے میں پائی جاتی ہے اور اس مصلحت کی خاطر جو اس کو ترک کر دینے میں پوشیدہ ہے، ان کاموں کو انجام دیتا ہے یا ان سے اجتناب کرتا ہے، یعنی علّتِ غائی اور انسان کو متحرک کرنے والی طاقت، مصلحت ہے نہ کہ لذّت۔ لذّت کو طبیعت تشخیص دیتی ہے اور مصلحت کو عقل، لذّت خواہشات کو ابھارتی ہے اور مصلحت عقل کو متحرک کرتی ہے، انسان کو التذاذی کاموں سے لذت ملتی ہے، لیکن مصلحتی کاموں سے لذّت نہیں ملتی، مگر وہ اس تصوّر سے کہ اس طرح وہ اپنی آخری مصلحت سے (کہ وہ خیر و کمال یا مستقبل میں کوئی لذّت ہے) ایک قدم نزدیک ہو گیا ہے، خوش ہو جاتا ہے، جن کاموں سے انسان کو لذت اور مسرّت ملتی ہے اور جن کاموں سے اسے کوئی لذّت نہیں ملتی ان میں فرق ہے، بلکہ بعض اوقات دوسری نوعیت کے کام تکلیف دہ ہوتے ہیں، لیکن انسان اپنی مرضی سے ہنسی خوشی اس تکلیف کو برداشت کر لیتا ہے، چونکہ مصلحتی کاموں کے نتائج بہت دیر میں حاصل ہوتے ہیں، لہٰذا ان سے لذت و مسرت حاصل نہیں ہوتی، لیکن انسان ان کاموں سے راضی رہتا ہے، لذت و رنج میں انسان اور حیوان دونوں شریک ہیں لیکن رضا اور پسندیدگی یا ناراضگی و ناپسندیدگی صرف انسان کی خصوصیات میں سے ہیں، جس طرح سے آرزو اور تمنّا انسان کی خصوصیات میں سے ہے۔ آرزو، رضا اور ناراضگی انسان کے تفکّرات کے دائرہ اور معقولات کی قلمرو میں ہے نہ کہ حواس اور حس اور اوہامات کی حدود میں۔

یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ التذاذی کاموں کے برخلاف جو کہ احساسات اور خواہشات کے زیرِ اثر انجام دیئے جاتے ہیں۔ انسان اپنے تدبیری کاموں کو عقل و ارادہ کے سہارے انجام دیتا ہے، کسی کام کے عقل کے حکم کے ماتحت انجام پانے کا مقصد یہ ہے کہ عقل کی محاسب طاقت کسی دور دراز لذت، خیر اور کمال کو دیکھتی ہے اور اس مقصد تک پہنچنے کے راستوں کا انکشاف کرتی ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے منصوبہ بناتی ہے حالانکہ ممکن ہے کہ ان راستوں کا طے کرنا اچھا خاصا کٹھن کام ہو، اور ارادہ کی طاقت کے ذریعے انجام پانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں ایک ایسی طاقت پائی

جاتی ہے جو عقل کی طاقت سے وابستہ ہے، اور اس سے عقل کی منظور کی ہوئی تجاویز پر عمل کرواتی ہے، اور بعض اوقات تمام طبیعی کششوں، جاذبوں اور خواہشوں کے برخلاف عقلی اور فکری منصوبوں کو عملی جامہ پہناتی ہے۔

ایک طالب علم کی جوانی کی طبیعت اس کو کھانے، پینے، سونے، کھیل کود اور عیش و عشرت کی طرف دعوت دیتی ہے، لیکن اس کی محاسب عقل جو ایک طرف سے ان کاموں کے خطرناک نتائج اور دوسری طرف سے محنت و کوشش، جدوجہد اور لذت و شہوت سے چشم پوشی کرنے کے تابناک انجام کو سوچتی ہے، مصلحت کے تقاضوں کی بنا پر اس کو حکم دیتی ہے کہ وہ دوسری شق کو انتخاب کرلے، اس مقام پر انسان عقل کے حکم یعنی مصلحت کو طبیعت کے حکم یعنی لذت پر ترجیح دیتا ہے، اسی طرح سے ایک بیمار دوا سے نفرت کرتا ہے، کڑوی اور بدمزہ دوا پینا اس کے لئے مشکل ہے، لیکن مصلحت اندیش عقل کے حکم سے اور خواہشات پر حاکم ارادہ کی طاقت کے ذریعہ وہ کڑوی اور بدمزہ دوا کو پی جاتا ہے۔

اس لئے جس انسان کی فکر و ہمت یعنی عقل و ارادہ جتنا زیادہ مضبوط اور طاقتور ہوتا ہے وہ اتنی ہی آسانی سے اور مضبوطی سے اپنے تمایلات کے برخلاف اپنے ہدف کی جانب بڑھتا اور احکام کی اطاعت کرتا ہے۔

انسان اپنی تدبیری کوششوں میں ہمیشہ ایک منصوبہ، ایک اصول اور ایک نظریہ پر عمل کرتا ہے، انسان عقل و ارادہ کے میدان میں جتنا زیادہ ترقی یافتہ ہوگا۔ اس کی کوششیں اتنی ہی زیادہ تدبیری ہونگی، اور وہ جتنا زیادہ حیوانیت سے نزدیک ہوگا اس کی کوششیں اتنی ہی زیادہ التذاذی ہونگی کیونکہ حیوان کی تمام کوششیں التذاذی ہیں، حیوانوں میں بعض اوقات ایسی کوششیں اور فعالیتیں نظر آتی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ دور دراز کے نتائج اور مقاصد کے لئے ہیں، جیسے گھونسلا بنانا، ہجرت، جنسی ملاپ اور تولید نسل، لیکن ان میں سے کوئی کام بھی سمجھ بوجھ کر، مقصد سے واقف ہوکر، مقصد تک پہنچانے والے راستوں کو تلاش کرنے کے لئے سوچ بچار اور وسیلہ کو انتخاب کرکے انجام نہیں پاتا

بلکہ ان سے یہ تمام کام ایک غیبی طاقت کی طرف سے ایک قسم کے جبری اور غریزی الہام کے زیر اثر انجام پاتے ہیں، تدبیری کوششوں کے نقطۂ نظر سے انسان کی کوششوں کا دائرہ اس قدر وسیع ہو جاتا ہے کہ وہ التذاذی کوششوں کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے، یعنی ممکن ہے مصلحتی منصوبے اتنی زیادہ توجّہ کے ساتھ بنائے جائیں کہ لذتیں مصلحتوں کے دائرہ میں آ جائیں اور ہر لذت، لذت ہوتے ہوئے مصلحت بھی ہو، اور ہر طبیعی کوشش و فعّالیت، طبیعت کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے عقل کے حکم کی بھی اطاعت کرتی ہو۔ اگر تدبیری فعّالیتیں التذاذی کوششوں کو اپنے اندر سمولیں اور اگر التذاذی کوششیں زندگی کے عمومی اور کلّی تدبیری منصوبوں کا ایک جزء بن جائیں تو طبیعت عقل کے ساتھ اور خواہشات ارادہ کے ساتھ متحد ہو جائیں گی۔

تدبیری کوششیں چونکہ بڑے اور دور رس اغراض و مقاصد کے محور پر گھومتی ہیں اس لئے انہیں ان مقاصد تک رسائی کے حصول کی خاطر لازمی طور پر کسی نہ کسی منصوبہ بندی، اسلوب اور روش کو اپنانے کی ضرورت ہوتی ہے، اور جہاں تک انفرادی معاملات کا تعلق ہے تو جب ایک فرد خود اپنے لئے تدبیر کرتا ہے تو نقشہ کھینچنے، منصوبہ بنانے، نظریہ کے تعیّن، راہ و روش اور ذرائع کو معیّن کرنے کا کام انفرادی عقل ہی انجام دیتی ہے اور یہ سب باتیں اس کی ذاتی تعلیمات اور عرفان و آگہی کی سطح، اور قضاوت کی طاقت سے وابستگی رکھتی ہیں۔

اگر بفرضِ محال تدبیری کوششیں اپنی بلندی کے آخری مرحلہ پر پہنچ ہی جائیں تب بھی انسان کی کوششوں کے انسانی ہونے کے لئے کافی نہیں ہیں، انسان کی تدبیری کوششیں، انسانیت کے لئے لازمی شرط ہیں کیونکہ انسان کی آدھی انسانیت کو اس کی عقل و عرفان و آگہی اور تدبیری تشکیل دیتی ہے لیکن یہ شرط کافی نہیں ہے، انسانی کوشش اس وقت انسانی ہوتی ہے جب وہ ارادی اور عاقلانہ ہونے کے علاوہ انسانیت کے بلند مرتبہ رجحانات کے ڈھرے پر بھی ہو، یا کم از کم ان بلند مرتبہ رجحانات کے ساتھ ضدیت نہ رکھتی ہو، ورنہ انسان کی سب سے زیادہ خطرناک مجرمانہ کوششیں اکثر و بیشتر تدبیروں، ہوشیاریوں

منصوبوں اور مصلحت اندیشیوں کے ہمراہ ہی ہوتی ہیں، سامراجیوں کے شیطانی منصوبے ہمارے اس دعویٰ کے بہترین گواہ ہیں۔ جب تدبیری طاقت انسانی اور ایمانی رجحانات سے جدا ہو جائے اور مادی و حیوانی مقاصد کے لئے استعمال کی جانے لگے تو اسلامی اور دینی اصطلاحوں میں اس کو "نکرا" اور "شیطنت" کا نام دیا جاتا ہے۔ پھر صرف یہی نہیں کہ ضروری نہیں ہے کہ ہر تدبیری کوشش انسانی بھی ہو، بلکہ اگر یہی کوشش حیوانی مقاصد کے محور کے گرد انجام پائے تو یہ حیوانی التذاذ کی کوششوں سے کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک حیوان اپنے پیٹ کو بھرنے کے لئے کسی حیوان یا انسان کو پھاڑ کھاتا ہے۔ لیکن مدبّر اور محاسب انسان اپنی درندگی کی تسکین کے لئے شہروں کو ویران کر دیتا ہے اور لاکھوں بے گناہ انسانوں کو چشم زدن میں بھون ڈالتا ہے۔

آیئے ہم اس مسئلے کو نظر انداز کئے دیتے ہیں ایسی صورت میں آپ اتنے سے سوال کا جواب دے دیجئے کہ کیا عقلی مقاصد انسان کی تمام تر انفرادی مصلحتوں کے نقطۂ نظر سے کافی ہیں؟

یا بالفاظ دیگر انفرادی مصلحتوں کی نشاندہی کے لحاظ سے انفرادی عقل کس حد تک کام کر سکتی ہے؟

اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عقل و فکر کی طاقت زندگی کی محدود اور جزئی تدبیروں کے لئے ضروری اور مفید ہے، انسان اپنی زندگی میں ہمیشہ کچھ مسائل سے دوچار رہتا ہے، جیسے دوست کا انتخاب، تعلیمی موضوع کا انتخاب، شریک زندگی کا انتخاب، پیشہ کا انتخاب، سفر، معاشرت، تفریح، نیک اعمال، برائیوں کو ختم کرنے کے لئے جدوجہد وغیرہ۔ بیشک ان تمام چیزوں میں انسان فکر، سوچ بچار اور تدبیر کا محتاج ہے اور وہ ان معاملات میں جتنی زیادہ سوچ بچار سے کام لیتا ہے اتنا ہی زیادہ کامیاب رہتا ہے اور بعض اوقات اس کو ان مسائل میں دوسروں کے تجربہ اور فکر سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے (اصولِ مشاورت)۔ ان تمام جزئی موادوں میں انسان منصوبہ بناتا ہے اور ان پر عمل کرتا ہے۔

لیکن کلّی اور وسیع دائرہ کی نوعیت کیا ہے؟ کیا انسان میں اتنی توانائی پائی جاتی ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی کے تمام مسائل کے لئے ایک ایسا منصوبہ بنائے جو سب کو گھیرے ہوئے ہو اور اس کی

زندگی کی تمام مصلحتوں پر منطبق ہو ؟ یا یہ کہ انفرادی فکری منصوبہ بندی کی توانائی صرف جزئی اور لامحدود مسائل کے دائرہ میں ہے اور زندگی کی تمام مصلحتوں پر احاطہ جس میں ہر قسم کی سعادت اور خوش بختی موجود ہو عقلی طاقت کے بس کی بات نہیں ہے ؟

بعض فلسفی اس طرح کی "خود کفائی" کے معتقد ہیں، انہوں نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ ہم نے سعادت و شقاوت کے راستوں کا انکشاف کر لیا ہے، اور ہم عقل و ارادہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے کو خوش نصیب بنالیں گے۔

لیکن اس کے باوجود دنیا میں ایسے دو فلسفی نہیں مل سکیں گے جو اس راستہ کو ڈھونڈ نکالنے میں یکساں خیالات رکھتے ہوں، بلکہ صورت حال یہ ہے کہ خود سعادت جو اصلی اور آخری مقصد ہے اور سرسری نظر میں اس کا مفہوم واضح اور بدیہی معلوم ہوتا ہے، ان کے نزدیک مبہم ترین مفاہیم میں سے ایک ہے، یہ مسئلہ کہ سعادت کیا ہے ؟ اور اس کے اسباب کیا ہیں ؟ ابھی تک ان فلسفیوں کے درمیان ایک مجہول مسئلہ کی شکل میں موردِ بحث ہے، اور اس کا مفہوم واضح نہیں ہو سکا، کیوں ؟ اس لئے کہ ابھی تک خود انسان اور اس کی استعدادوں اور صلاحیتوں کی معرفت نہیں ہو سکی ہے، یہ بات ممکن نہیں ہے کہ خود انسان کی معرفت کے بغیر یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی سعادت کیا ہے اور کن چیزوں کے ذریعے نصیب ہو سکتی ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ انسان ایک معاشرتی موجود ہے، سماجی زندگی اسکے لئے ہزاروں مسائل اور مشکلات پیدا کر دیتی ہے اس کا فریضہ ہے کہ ان تمام مشکلات کو حل کرے اور ان تمام مسائل کے مقابلہ میں اپنے فرائض کا تعین کرے اور چونکہ وہ معاشرتی موجود ہے لہٰذا اس کی سعادت و خوش بختی، اس کے ارمان، اس کے خیر و شر کے معیار، اس کی راہ و روش، اس کے ذرائع کا انتخاب، دوسروں کی سعادتوں، ارمانوں، خیر و شر کے معیاروں، راہ و روشوں اور ذرائع کے انتخاب کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں، وہ دوسروں سے الگ ہو کر اپنا راستہ منتخب نہیں کر سکتا، اس کو اپنی سعادت کو اسی شاہراہ پر ڈھونڈنا چاہئے جو معاشرہ کو سعادت و کمال تک پہنچا دے۔

اور اگر ابدی زندگی، روح کی جاودانیت اور عقل کی ناتجربہ کاری کے مسائل کو دنیاوی زندگی اور نشأۃ کی نسبت سے دیکھنا چاہیں تو مسئلہ اور بھی مشکل اور پیچیدہ ہو جائے گا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ایک مکتب، نظریہ اور آئیڈیالوجی کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔ اس مکتب سے ہماری مراد ایک ایسا کلّی نظریہ، جامع، ہم آہنگ اور منسجم منصوبہ ہے جو انسان کے اصل مقصد کو کامل اور ہر شخص کو خوش نصیبی وسعادت سے ہمکنار کرا سکے اور اس منصوبہ میں بنیادی خطوط اور روشیں، واجبات ومحرمات، اچھائیاں اور برائیاں، مقاصد اور ذرائع، بیماریاں اور علاج، ذمہ داریاں اور فرائض پورے طور پر واضح ہوں اور وہ منصوبہ تمام لوگوں کے لئے ذمہ داریوں اور فرائض کے الہام کا سرچشمہ ہو۔

انسان اپنی خلقت کے ابتدائی ایام سے اور کم از کم اس زمانہ سے جبکہ سماجی زندگی کی وسعت اور ارتقاء میں کچھ اختلافات کا سبب بنی۔[1] ایک آئیڈیالوجی اور مکتب فکر (اور قرآن کی اصطلاح میں شریعت) کا محتاج تھا۔ جتنا زمانہ گزرتا گیا اور انسان ترقی وکمال کے مراحل طے کرتا گیا اس ضرورت کا احساس اور بھی زیادہ شدید ہوتا گیا۔ ماضی میں خونی، نسلی، خاندانی، قبائلی اور قومی رجحانات انسانی معاشروں پر ایک "اجتماعی روح" کی مانند حاکم تھے۔ یہ روح اپنے لحاظ سے کچھ اجتماعی ارمانوں اور عقائد کو (چاہے وہ غیر انسانی ہی ہوں) ایجاد کرتی تھی اور معاشرہ کو متحد کر کے ایک راستہ پر گامزن کرتی تھی۔ علمی اور عقلی ترقیوں نے رشتوں کو کمزور بنا دیا۔ اپنی ذاتی خصوصیت کی بناء پر علم کا جھکاؤ انفرادیت کی جانب ہے، اس لئے وہ محبتوں اور عطوفتوں کو کم اور رشتوں کو کمزور بناتا ہے۔ اس دور کے انسان کو (اور مستقبل کے انسان کو بدرجہ اولیٰ) جو چیز اتحاد اور یکتائی عطا کرتی، مشترکہ ارمان دیتی اور اس کے لئے خیر وشر، واجب وحرام کا معیار بنتی ہے، وہ زندگی

---

[1] قرآن حکیم کی آیات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت نوحؑ کے زمانہ سے یہ اختلافات شروع ہوئے ہیں، اور اس ضرورت کا احساس ہوا ہے۔ آپ سے پہلے کے انبیاء صاحب شریعت نہ تھے۔ سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۳۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً .... کے ذیل میں تفسیر المیزان مطالعہ فرمائیے

کا ایک ایسا فلسفہ ہے جس کو سمجھ بوجھ کر انتخاب کیا گیا ہو، جو منطق و استدلال سے آراستہ ہو اور ارمان خیز ہو یا بالفاظ دیگر ایک جامع اور مکمل آئیڈیالوجی ہو۔

اس طرح کے فلسفہ کے لئے آج کے انسان کی احتیاج ماضی کے انسان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہے۔ ایسا فلسفہ جو انسان میں فرد اور انفرادی مفادات کے ماوراء حقائق سے عشق پیدا کر سکے، آج اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے کہ مکتب اور آئیڈیالوجی سماجی زندگی کی ضروریات میں سے ہے۔

کس میں اتنی توانائی ہے جو اس قسم کے مکتب کو ایجاد کر سکے اور اس کا منصوبہ بنا سکے؟ بیشک ایک فرد کی عقل اس کام کو انجام دے ہی نہیں سکتی، تو کیا چند عقلیں مل جل کر اس اہم کام کو انجام دے سکتی ہیں؟ کیا انسان اپنے تمام گزشتہ اور موجودہ تجربوں اور معلومات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس قسم کا منصوبہ بنا سکتا ہے؟ اگر انسان ابھی تک خود اپنے آپ کو نہیں پہچان سکا ہے، اور اس کی نظر میں سب سے زیادہ مجہول چیز خود انسان ہی ہے، تو انسانی معاشرہ اور معاشرتی سعادت بدرجۂ اولیٰ اس سے بھی زیادہ مجہول ہونا چاہئے، ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ یہی وہ مقام ہے کہ اگر ہم کائنات اور تخلیق کے بارے میں صحیح نظریہ رکھتے ہوں نظام ہستی کو ایک معتدل نظام سمجھتے ہوں، ہستی اور وجود میں خلاء اور بے مقصدیت کے قائل نہ ہوں تو ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس عظیم نظام خلقت نے سب سے زیادہ اہم ضرورت اور احتیاج کو یونہی چھوڑ دیا ہے بلکہ اس نے انسانی عقل کے افق سے کہیں زیادہ بلند و بالا افق یعنی وحی کے افق سے اس شاہراہ کے بنیادی اور اصلی خطوط کو مشخص کر دیا ہے (اصل نبوت) عقل اور علم کا کام یہ ہے کہ وہ انہی بنیادی اور اصلی نقوش کے دائرہ میں قدم بڑھائیں، بوعلی سینا نے اپنی کتاب "نجات" میں اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہ انسان ایک ایسی شریعت الٰہی کا محتاج ہے جس کو ایک انسان (نبی) کے وسیلہ سے بیان کیا گیا ہو، کتنی اچھی بات کہی ہے ۔! وہ کہتے ہیں:۔

فالحاجة الی هذا الانسان فی ان یبقی نوع الانسان و یتحصل وجوده اشد من الحاجة الی انبات الشعر علی الحاجبین و تقعیر الاخمص من القدمین و اشیاء اخری من المنافع التی لا ضرورة الیها فی البقاء

بل اکثر ما لها انها تنفع فی البقاء۔"

نوع انسانی کی بقاء اور انسان کو اس کے انسانی وجود کو کمال تک پہنچانے، الٰہی شریعت اور انسانی مکتب کو بیان کرنے کے لئے نبی کی ضرورت ابروؤں پر بال اگاتے اور دونوں پیروں کو گڑھے دار بنانے اور اسی قسم کے ان دوسرے مفادات کی احتیاج سے کہیں زیادہ ہے جو صرف نوع انسان کی بقاء کے لئے مفید ہیں لیکن نوع انسان کی بقاء کے لئے ضروری اور لازمی نہیں ہیں۔

یعنی جب خلقت کی اس انتظامیہ نے چھوٹی چھوٹی اور غیر ضروری احتیاجات کو مہمل نہیں چھوڑا ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ اس سب سے زیادہ ضروری احتیاج کو برطرف کئے بغیر چھوڑ دے؟

لیکن اگر ہم وجود اور تخلیق کے بارے میں ایک صحیح نظریہ سے محروم ہوں تو ہم کو یہ بات تسلیم کرلینی پڑے گی کہ انسان کی قسمت ہی میں گمراہی اور ضلالت لکھی ہوئی ہے کیونکہ طبیعت کے اس ظلمتکدہ میں سرگرداں انسان کی بنائی ہوئی کوئی بھی آئیڈیالوجی اور منصوبہ، سرگردانی، حیرانی اور پریشانی کے علاوہ کوئی اور فائدہ نہیں پہنچا سکے گی۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ایک مکتب اور آئیڈیالوجی کا وجود ضروری ہے۔ اسی طرح سے یہ بات بھی ثابت ہوجاتی ہے کہ فرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مکتب اور آئیڈیالوجی سے وابستہ اور ملحق ہوجائے۔

لیکن فرد کا کسی مکتب اور آئیڈیالوجی سے وابستہ اور ملحق ہونا اس وقت واقعی صورت اختیار کرتا ہے جبکہ یہ وابستگی "ایمان" کا روپ اختیار کرلے اور ایمان ایسی ایک حقیقت ہے جو طاقت کے سہارے اور مصلحت کی خاطر حاصل نہیں ہوسکتی، طاقت کے ذریعے کسی مطلب کو منوایا اور سروں کو جھکایا جاسکتا ہے، لیکن آئیڈیالوجی سر جھکانے کا نام نہیں، آئیڈیالوجی دل سے قبول کرنے اور جذب ہوجانے کی چیز ہے۔ آئیڈیالوجی کے لئے ایمان کی ضرورت ہے۔

ایک مفید اور کارآمد آئیڈیالوجی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک طرف سے ایک قسم کی جہاں بینی پر تکیہ رکھتی ہو تاکہ عقل کو قانع اور فکر کے لئے غذا فراہم کرسکے، اور دوسری طرف سے وہ اپنی جہاں بینی

سے منطقی طور پر کچھ ایسے مقاصد کو حاصل کرے جن میں کشش اور جاذبیت موجود ہو تاکہ ایسی صورت میں عشق و اقناع جو ایمان کے دو بنیادی عنصر ہیں آپس میں مل جل کر دنیا کو تعمیر کرنے کے قابل ہو جائیں۔

گفتگو کے اس مرحلہ میں کچھ مسائل ہیں جن کو بطور اختصار اور اجمال بیان کرنا ضروری ہے البتہ اس سلسلہ میں تفصیلی بحث کسی دوسرے وقت ہی ممکن ہو گی۔

الف:- آئیڈیالوجی (نظریات) دو طرح کی ہوتی ہیں: انسانی اور گروہی، انسانی آئیڈیالوجی وہ نظریات ہیں جن کے مخاطب تمام نوع انسان ہیں، نہ کہ کوئی قوم یا نسل یا کوئی خاص طبقہ، یہ نظریئے تمام نوع انسان کی نجات کے دعویدار ہوتے ہیں اور کسی خاص طبقہ یا گروہ کی نجات کا منصوبہ پیش نہیں کرتے، وہ تمام انسانوں کو شامل کئے ہوتے ہیں، صرف کسی مخصوص طبقہ کو نہیں۔ اس کے حامی کسی مخصوص طبقہ، گروہ یا قوم کے افراد کی بجائے ہر گروہ اور ہر قوم کے لوگ ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس گروہی آئیڈیالوجی کا مخاطب ایک مخصوص گروہ یا طبقہ ہوتا ہے اور وہ فقط اسی گروہ کی نجات اور قیادت کا مدعی ہوتا ہے، وہ جو منصوبہ بھی پیش کرتا ہے وہ اسی گروہ کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ اس کے حامی بھی صرف اسی گروہ میں پائے جاتے ہیں اور وہ اپنے سپاہیوں کو صرف اسی گروہ میں سے انتخاب کرتی ہے۔

ان دو میں سے ہر ایک نظریہ انسان کے بارے میں ایک خاص طرز فکر پر مبنی ہے، عام اور انسانی نظریہ جیسے اسلامی نظریہ انسان کے متعلق ایسی معرفت کا حامل ہے جسے فطرت کہا جاتا ہے، اسلام کی نظر میں انسان خلقت ہی کے موقع پر، تاریخی اور معاشرتی عوامل و اسباب کی تاثیر سے پہلے ایک مخصوص وجودی پہلو کا مالک ہو گیا، اور اس کو ایسی عظیم استعدادیں دی گئی ہیں جو اس کو حیوانوں سے ممتاز کرتی اور اس کو ہویت عطا کرتی ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق انسان خلقت کے موقع پر ہی ایک قسم کے شعور اور "نوعی ضمیر" سے جو ہر انسان میں موجود ہے، بہرہ مند ہو گیا، اور اسی فطری وجدان نے اس کو "نوعی تعین"، انسان بننے، مخاطب واقع ہونے، تحرک و تحریک اور دعوت کی صلاحیت

دی ہے، ایسے مکاتبِ فکر نوعِ انسان کے مشخص فطری ضمیر پر تکیہ کرتے ہوئے اپنی دعوت کا آغاز اور تحریک کو شروع کرتے ہیں۔

بعض آئیڈیالوجی انسان کے بارے میں کسی اور طرزِ فکر کی حامل ہوتی ہیں۔ ان آئیڈیالوجیوں کی نظر میں نوعی انسان میں مخاطب قرار پانے، تحریک و تحرک اور دعوت کی صلاحیت نہیں پائی جاتی، کیونکہ انسان کے تاملات، ضمیر اور شعور، قومی زندگی میں تاریخی عوامل کے زیرِ اثر یا انسان کے طبقاتی موقف میں سماجی عوامل کے زیرِ اثر مشخص ہوتے ہیں۔ تاریخی یا مخصوص سماجی عوامل و اسباب سے قطع نظر انسان کے پاس نہ شعور ہے اور نہ ضمیر، اور نہ دعوت کا مخاطب قرار پانے کی صلاحیت، بلکہ وہ عینی موجود ہونے کی بجائے ایک انتزاعی موجود ہے، مارکس ازم اور اسی طرح کے قومی فلسفہ کی بنیاد انسان کے بارے میں اسی قسم کے اندازِ فکر پر قائم ہے۔ ان فلسفوں کی حدِ نگاہ طبقاتی مفادات یا قومی و نسلی احساسات یا زیادہ سے زیادہ قومی ثقافت تک ہی محدود ہے۔

بیشک اسلامی مکتبِ فکر پہلی قسم میں سے ہے۔ اس کی حدِ نظر انسان کی فطرت ہے۔ لہٰذا اسلام کے مخاطب "اَلنَّاس" سب لوگ ہیں[1]۔ کوئی خاص طبقہ اور گروہ نہیں، اسلام نے عملی طور پر ہر گروہ کے

---

[1] بعض اوقات اس کلمہ کے مفہوم میں جو کہ "تمام لوگ" کے معنی میں ہے غلطی کی جاتی ہے اور اس کو "عوام" کے معنی میں جو کہ ممتاز طبقہ کے مقابلے میں ہے سمجھا جاتا ہے۔ اور چونکہ اسلام کا مخاطب "النّاس" ہے لہٰذا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ دینِ اسلام عوامی دین ہے اور ضمناً اسلام کے لئے اس کو فضیلت سمجھتے ہیں لیکن یہ بات معلوم ہونا چاہئے کہ جو چیز حقیقت ہے اور اسلام کے لئے فضیلت بھی ہے، یہ ہے کہ اسلام عوام کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ہے نہ یہ کہ وہ صرف عوام کو اپنا مخاطب بناتا ہے اور اس کی آئیڈیالوجی طبقاتی اور گروہی آئیڈیالوجی ہے، اور جو چیز سب سے زیادہ فضیلت کا سبب ہے وہ یہ ہے کہ استحصال شدہ طبقہ کے علاوہ خود استحصال کرنے والا طبقہ اور سرمایہ داروں میں سے بعض ضمیروں کو کبھی کبھی انسانی فطرت پر تکیہ کرتے ہوئے استحصال شدہ طبقہ کے حق میں جھنجوڑ دیا ہے۔

درمیان سے اپنا حامی اور مددگار پیدا کر لیا ہے۔ حتیٰ کہ اس طبقہ کے درمیان سے بھی جس سے جنگ کرنے کے لئے کمر باندھے ہوئے ہے یعنی قرآن کی اصطلاح میں مترف (سرکش سرمایہ دار) اور ملاء (سردار طبقہ، ایک طبقہ سے خود اسی طبقہ کیخلاف ایک گروہ سے خود اسی گروہ کے مفادات کیخلاف جنگ کرنے کے لئے سپاہی بھرتی کرتا ہے، بلکہ ایک شخص کو خود اپنی برائیوں اور تباہ کاریوں کے خلاف ابھارنا ایسا کام ہے جس کو اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں بہت زیادہ انجام دیا ہے اور انجام دے رہا ہے۔ اسلام چونکہ ایک دین ہے اور انسان کے وجود کی گہرائیوں تک اس کی جڑیں پھیلی ہوئی ہیں، اور دوسری طرف سے انسان کی انسانی فطرت پر تکیہ کرتا ہے اس لئے اس میں اتنی توانائی ہے کہ فرد کو خود اپنی بدکاریوں کے خلاف برسرِ پیکار کر دے اور اس بات پر مجبور کر دے کہ وہ خود اپنے ہی خلاف وہ انقلاب لائے جس کا نام "توبہ" ہے، گروہی آئیڈیالوجیوں میں صرف اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ ایک فرد کو دوسروں کے خلاف یا ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ کے خلاف بھڑکا دیں، لیکن ان میں نہ تو اتنی طاقت ہے کہ وہ فرد کو خود اپنے خلاف انقلاب لانے کے لئے آمادہ کر سکیں اور نہ ہی یہ توانائی ہے کہ فرد کو اپنے اندر خود اپنا محافظ بنا سکیں۔

چونکہ اسلام مذہب بھی ہے اور آخری دین بھی اس لئے وہ تمام آسمانی مذاہب سے بڑھ کر اجتماعی عدل کو برقرار کرنے کے لئے آیا ہے[1]۔ اور فطری طور پر اس کا مقصد محروموں اور مستضعفوں کو نجات دلانا ہے اور ستمگروں کے ساتھ جنگ کرنا ہے، لیکن اسلام کے مخاطب صرف محروم اور مستضعف لوگ ہی نہیں اسی طرح سے اس کے حامی اور مددگار صرف اسی طبقہ میں نہیں ہیں بلکہ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اسلام نے ایک طرف سے مذہب کی طاقت اور دوسری طرف سے انسانی فطرت پر اعتماد کرتے ہوئے ان طبقوں تک کے درمیان سے اپنے سپاہیوں کو منتخب کیا ہے، جن کے خلاف جنگ کرنے کے لئے کمر باندھے ہوئے

---

[1] الحدید ۲۵ (لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ
اعراف ۲۹ (..... قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ .....)

ہے۔ اسلام حیوانیت پر انسانیت، جہل پر علم، ظلم پر عدل، ناحق امتیازوں پر مساوات، رذالت پر فضیلت، گناہوں سے لاپرواہی پر تقویٰ، نیز شرک پر توحید کی کامیابی کا نظریہ ہے۔ جبّاروں اور متکبروں پر مستضعفوں کی کامیابی اور غلبۂ الٰہی کامیابیوں کے مصداقوں میں سے ایک مصداق ہے۔

(ب) اس گفتگو کے بعد یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ کیا اصلی انسانی ثقافت کی ماہیّت ایک ہے؟ یا یہ کہ ایک متحد ثقافت کا وجود ہے ہی نہیں بلکہ اس ثقافت کی ماہیّت قومی، ملّی، یا طبقاتی ہے، جو کچھ اس وقت موجود ہے یا مستقبل میں ایجاد ہوگا، وہ کئی اور متعدد ثقافتیں ہیں۔

یہ مسئلہ بھی اسی بات سے وابستہ ہے کہ آیا نوعِ انسان ایک منفرد اور اصیل فطرت سے برخوردار ہے اور یہی منفرد اور اصیل فطرت انسانی ثقافت کو اتحاد اور یکتائی عطا کرتی ہے یا اس طرح کی منفرد فطرت موجود ہی نہیں ہے، بلکہ ثقافتوں کو تاریخی، قومی اور جغرافیائی اسباب وعوامل نے بنایا ہے اور یا طبقاتی منفعت طلب رجحانات نے اس کو ایجاد کیا ہے۔ چونکہ اسلام اپنی جہاں بینی میں ایک اور تنہا فطرت کا قائل ہے لہٰذا ایک اور تنہا آئیڈیالوجی کا بھی طرفدار اور ایک منفرد ثقافت کا بھی حامی ہے۔

(ج) بدیہی ہے کہ صرف ایک انسانی آئیڈیالوجی، نہ کہ گروہی آئیڈیالوجی اور ایک یکہ وتنہا آئیڈیالوجی نہ وہ آئیڈیالوجی جو انسان کے تجزیہ اور تقسیم کی بنیاد پر ہو۔ ایک فطری آئیڈیالوجی جو مفاد پرست آئیڈیالوجی نہ ہو، وہی انسانی اقدار پر تکیہ کرسکتی ہے اور انسان کی ماہیت کی مالک ہوسکتی ہے۔

(د) کیا ہر آئیڈیالوجی زمان ومکان سے وابستہ ہے؟ کیا انسان مجبور ہے کہ ہر بدلتے ہوئے زمانہ اور مختلف قسم کے ماحول ومکان میں ایک مخصوص مکتبِ فکر سے وابستہ رہے (یعنی انسان مجبور ہے کہ جیسے جیسے زمانہ بدلتا جائے اس کا ماحول اور رہن سہن کی جگہ بدلتی جائے ویسے ویسے اپنے مکتبِ فکر کو بھی تبدیل کرتا جائے اور ایک نئی آئیڈیالوجی کو اپنائے)۔ کیا آئیڈیالوجی (جغرافیائی منطقہ کے مطابق) اصلِ اختلاف اور زمان کے مطابق) اصل نسخ وتبدیل حکم فرما ہے؟ یا یہ کہ جس طرح سے انسان کی آئیڈیالوجی گروہی اعتبار سے ایک اور منفرد ہے اسی طرح زمانی اور مکانی لحاظ سے بھی یگانہ یعنی واحد ومتحد ہے، بالفاظِ دیگر جس

طرح سے گروہی نقطہ نظر سے عام ہے نہ کہ خاص، زمانی اور مکانی نقطہ نظر سے بھی مطلق ہے نہ کہ نسبی۔

کسی نظریہ کا زمانی اور مکانی لحاظ سے مطلق یا نسبی ہونا یہ خود اپنی جگہ ایک نظر سے اس چیز سے وابستہ ہے کہ اس کا سرچشمہ انسان کی نوعی فطرت ہو، اور اس کا مقصد نوع انسان کی سعادت ہو، اور یا اس کا سرچشمہ گروہی مفادات اور قومی وطبقاتی احساسات ہوں۔

اور دوسری نظر سے یہ مسئلہ اس چیز سے وابستہ ہے کہ ہم معاشرتی تحولات اور تبدیلیوں کی ماہیت کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ کیا جب کسی معاشرہ میں تبدیلی آتی ہے اور وہ ایک دور کو طے کر کے نئے دور میں داخل ہو جاتا ہے تو اس معاشرہ کی ماہیت بدل جاتی ہے، اور نتیجہ میں اس پر ایسے قوانین حکم فرما ہو جاتے ہیں جو گزشتہ حکم فرما قوانین سے مغائر اور مختلف ہوتے ہیں جیسے پانی، حرارت کے ایک معین درجہ تک پہنچ کر بخارات میں بدل جاتا ہے، اور اس کے بعد اس پر مائعات کے قوانین کی بجائے گیس کے قوانین حکم فرما ہو جاتے ہیں، یا یہ کہ سماجی تبدیلیاں اور ترقیاں اس قسم کی نہیں، بلکہ معاشرے کے اصلی ارتقائی قوانین اور وہ مدار جس میں یہ معاشرہ تبدیل ہوتا ہے اپنی جگہ پر باقی ہیں معاشرے میں صرف منزل اور مرحلہ کے اعتبار سے تبدیلی واقع ہوتی ہے، نہ کہ محور اور ارتقاء کے قانون کے لحاظ سے جس طرح کہ تمام جاندار زندگی کے لحاظ سے تبدیلی اور ترقی کرتے ہیں لیکن ترقی اور کمال کے قوانین ہمیشہ اپنی جگہ پر باقی ہیں۔

اور ایک نظر سے یہ مسئلہ کہ ایک آئیڈیالوجی زمانی اور مکانی لحاظ سے مطلق ہے یا نسبی۔ اس مسئلہ سے وابستہ ہے کہ اس آئیڈیالوجی کی جہان بینی کیا ہے؟ علمی یا فلسفی اور مذہبی، چونکہ علمی آئیڈیالوجی ایک غیر مستحکم اور ناپائیدار، جہان بینی پر مبنی ہوتی ہے اس لئے وہ خود بھی پائیدار اور مستحکم نہیں ہو سکتی، اس کے برعکس وہ فلسفی جہان بینی جو اصولِ اولیہ اور بدیہیات اولیہ پر مبنی ہو، یا مذہبی جہان بینی جو وحی و نبوت پر استوار ہو، پائیدار اور ثابت ہوتی ہے۔

یہاں جس طرح سے اس بات کی فرصت نہیں ہے کہ فطرت کے مسئلہ پر گفتگو کی جائے جو اسلامی معارف کی "ام المسائل" ہے۔ اسی طرح معاشرہ کی تبدیلیوں اور تحولات کے سلسلہ میں بھی بحث د

گفتگو کرنے کی فرصت نہیں، لیکن اس کتاب کے چوتھے حصہ میں جہاں معاشرہ اور تاریخ کے بارے میں بحث و گفتگو کی جائے گی وہاں معاشرہ کی تبدیلیوں و تحولات اور فطرت کے ساتھ اس کے رابطہ کے بارے میں بھی تحقیقی بحث ہوگی۔

(ھ) خود آئیڈیالوجی پر اصل ثبات حکم فرما ہے یا اصل تغییر؟ ابھی تک گفتگو اس سلسلہ میں ہو رہی تھی کہ کیا مختلف زمانوں یا مختلف مکانوں میں انسان کا نظریہ مختلف ہوتا ہے؟ گویا پہلے نظریہ کی تبدیلی اور منسوخ ہونے کے بارے میں بحث و گفتگو تھی، لیکن اب ہمارے سامنے ایک دوسرا مسئلہ درپیش ہے اور وہ مسئلہ ایک آئیڈیالوجی اور نظریہ کی تبدیلی اور تحول سے متعلق ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ آئیڈیالوجی خواہ مفہوم کے لحاظ سے ہو، عام ہو یا خاص، مطلق ہو یا نسبی، چونکہ وہ خود ایک نومولود چیز ہے اور تمام نومولود چیزیں متغیر و متحول اور ارتقاء کی راہ پہ رواں دواں ہیں لہٰذا آئیڈیالوجی بھی ہمیشہ متغیر اور متحول رہتی ہے؟ کیا ایک نظریہ کی وہ حقیقت جو پیدائش کے دن ہوتی ہے اس حقیقت سے مختلف ہوتی ہے جو رشد و نمو اور ترقی کے دوران ہوتی ہے؟ یعنی ہمیشہ اس کی اصلاح ہوتی ہے، اس کی خامیوں اور لغزشوں کو دور کیا جاتا ہے، اور ہمیشہ قائدین اور اس آئیڈیالوجی کے ماہرین اس میں تجدید نظر کرتے ہیں۔ (جیسا کہ ہر زمانہ کی مادّی آئیڈیالوجیوں میں یہ بات نظر آتی ہے) ورنہ وہ بہت جلد پرانی اور بوسیدہ ہو جائے گی، اور اپنی صلاحیت کو کھو بیٹھے گی؟ یا یہ ممکن ہے کہ ایک آئیڈیالوجی کو اس طرح سے منظم کیا گیا ہو نیز اس میں انسان اور معاشرہ کے تحرک کے بنیادی داخلی نقوش پر اس طرح سے بھروسہ کیا گیا ہو کہ اس میں قائدین کی طرف سے کسی قسم کی تجدید نظر و اصلاح کی ضرورت نہ ہو بلکہ قائدین اور آئیڈیالوجی کے ماہرین کا کام صرف یہ ہو کہ وہ اس کے مفاہیم میں "اجتہاد" کریں اور نظریہ کی ترقی خود نظریہ کی بجائے اس کے اجتہاد کے میدانوں میں ہو؟

اس سوال کا جواب بھی گزشتہ سوالات کے جواب سے واضح ہو چکا ہے۔[1]

---

[1] محمد خاتم پیامبران کی پہلی جلد میں ختم نبوت کے مقالہ میں (یہ مقالہ علیحدہ ایک کتابچہ کی شکل میں بھی شائع

اسلام ایک جامع اور ہمہ گیر مکتب

اسلام جو کہ اس قسم کی جہان بینی کی بنیاد پر قائم ہوا ہے، ایک جامع اور حقیقت پسند مکتب ہے اسلام میں تمام انسانی ضروریات پر توجہ دی گئی ہے، چاہے وہ دنیاوی ہوں یا اخروی، جسمانی ہوں یا روحانی، عقلی و فکری ہوں یا احساسی و عطوفتی، فردی ہوں یا سماجی۔

اسلامی تعلیمات ایک لحاظ سے مجموعی طور پر تین حصوں میں تقسیم ہوتی ہیں :۔

(الف) اصول عقائد، یعنی وہ چیزیں جن کے سلسلہ میں عقائد کو حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنا ہر فرد کا فریضہ ہے، اس سلسلہ میں جو کام انسان کے ذمہ ہے وہ تحقیقی اور علمی کاموں میں سے ہے۔

(ب) اخلاقیات، یعنی ایسی خصلتیں جن کے لئے ہر مسلمان شخص پر واجب ہے کہ وہ خود کو ان خصلتوں اور خوبیوں سے سنوارے اور ان کی اضداد سے اپنے کو محفوظ رکھے، اس سلسلہ میں جو کام انسان کے ذمہ ہے وہ نگہداری یعنی مراقبتِ نفس اور خود سازی یعنی اصلاح نفس کی قسم سے ہے۔

(ج) احکام، یعنی وہ قوانین جو انسان کے بیرونی اور عینی کاموں سے تعلق رکھتے ہیں خواہ وہ کام معاشی ہو یا معادی، دُنیوی ہو یا اخروی، انفرادی ہو یا سماجی۔

اسلامی اصول عقائد مذہب شیعہ کے مطابق پانچ اصول ہیں :۔

توحید ، عدل ، نبوت ، امامت ، قیامت ۔

ہو چکا ہے) ہم نے اسلامی آئیڈیالوجی کی کلیت واطلاق اور اس کو مختلف مکانی حالات اور متغیر زمانی شرائط کے ساتھ تطبیق کرنے میں اجتہاد کے کردار اور یہ کہ جو چیز تبدیل ہوتی رہتی ہے اور ترقی کرتی رہتی ہے وہ اسلامی اجتہاد ہے نہ کہ اسلامی آئیڈیالوجی۔ اس سلسلہ میں ہم نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ محققین اس مقالہ کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

اسلام اصول عقائد کے سلسلے میں تقلید اور تعبّد کو کافی نہیں سمجھتا، کیونکہ اس سلسلہ میں ہر شخص کا فریضہ ہے کہ وہ ان کے بارے میں صحیح عقیدہ کو اپنائے۔ اسلام ضروری سمجھتا ہے کہ ہر شخص پوری آزادی کے ساتھ خود ان عقائد کی حقانیت اور ان کے صحیح ہونے کے بارے میں تحقیق کرے۔ اسلام کی نظر میں عبادت، نماز، روزہ جیسی جسمانی عبادت یا خمس و زکواۃ جیسی مالی عبادات میں منحصر نہیں ہے بلکہ ایک دوسری قسم کی بھی عبادت ہے، اور وہ فکری عبادت ہے، تفکّر یا فکری عبادت اگر انسان کی بیداری اور تنبّہ کے لئے ہو تو برسوں کی جسمانی عبادت سے بہتر ہے۔

قرآن کے نقطۂ نظر سے فکری لغزش کے مقامات

وہ قرآن جو تفکّر اور فکری نتائج حاصل کرنے کے لئے دعوت دیتا ہے اور فکر کرنے کو عبادت سمجھتا ہے، نیز اصول عقائد کے حصول کو منطقی تفکّر کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے صحیح نہیں سمجھتا اس نے ایک بنیادی بات کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ یہ کہ انسان کہاں کہاں فکری لغزشیں کرتا ہے اور ان کا سرچشمہ کیا ہے؟ غلطیوں اور گمراہیوں کا اصل سبب کیا ہے؟ اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ صحیح فکر کرے غلطی اور گمراہی سے دوچار نہ ہو تو اس کو کیا کرنا چاہئے؟ چنانچہ قرآن میں کچھ چیزیں غلطیوں اور گمراہیوں کے اسباب کے عنوان سے بیان ہوئی ہیں، جن کو آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ علم و یقین کی بجائے ظن و گمان پر تکیہ کرنا

قرآن کہتا ہے۔[۱] (الانعام ۱۱۶)

"اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر تم ان کی پیروی کرنا چاہو تو وہ تم کو راہِ حق سے گمراہ کر دیں گے،

---

[۱] وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ۔

کیونکہ وہ لوگ ظن اور گمان پر تکیہ کرتے ہیں (نہ کہ یقین پر) اور صرف اندازے و تخمینے سے کام کرتے ہیں"۔

قرآنِ کریم بہت سی آیتوں میں ظن و گمان کی پیروی کی بہت شدت کے ساتھ مخالفت کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے: (سورۃ الاسریٰ ۳۵)

"جب تک کسی چیز کے بارے میں علم و یقین نہ حاصل کر لو، اس کی پیروی نہ کرو"۔ [1]

آج فلسفی نقطۂ نظر سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ غلطیوں اور لغزشوں کے اہم اسباب میں سے ایک سبب یہی ہے، قرآن کے ایک ہزار سال بعد ڈیکارٹ نے اپنے استدلال کی پہلی اصل اسی چیز کو قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"میں کسی چیز کو اس وقت تک حقیقت نہیں سمجھتا جب تک کہ وہ چیز مجھ پر بدیہی نہ ہو جائے، میں جلد بازی، رجحان اور ذہن کی سبقت سے پرہیز کرتا ہوں، کسی چیز کو اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک وہ مجھ پر اس قدر واضح اور روشن نہ ہو جائے کہ میرے لئے اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہ رہ جائے"۔ [2]

۲۔ نفسانی خواہشات

انسان اگر صحیح فیصلہ کرنا چاہتا ہے تو اس کو چاہیئے کہ وہ جس مطلب کے بارے میں فکر کر رہا ہے اس کے سلسلہ میں غیر جانبداری کو پوری طرح ملحوظ رکھے رہے، یعنی وہ اس بات کی کوشش کرے کہ حقیقت پسند رہے اور دلائل کے سامنے اس قاضی کی مانند سر تسلیم خم کر دے جو کسی مسئلہ کے بارے میں تحقیق کر رہا ہو۔ کیونکہ قاضی اگر کسی کی طرف پہلے ہی سے مائل ہو تو اسے لاشعوری طور پر وہ دلیلیں زیادہ پسند آئیں گی جو اس شخص کے حق میں ہیں لیکن جو دلیلیں اس شخص کے خلاف اور دوسرے شخص کے حق میں ہوں گی وہ خود بخود قاضی کی

---

[1] وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ [2] "سیر حکمت در اروپا" جلد اول۔

نظروں سے گم جائیں گی اور یہی بات قاضی کی لغزش اور فیصلے میں غلطی کا سبب بن جائے گی۔

انسان اگر اپنے تفکرات میں کسی مطلب کے نفی یا اثبات کے بارے میں غیر جانبدار نہ رہے اور اس کی نفسانی خواہشات کسی ایک جانب ہو جائیں تو خواہ مخواہ لاشعوری طور پر اس کی فکر کا رخ اس کی نفسانی خواہشات کی جانب مڑ جائے گا، یہی وجہ ہے کہ قرآن گمان وظن پر بھروسہ کرنے کی طرح نفسانی خواہشات کو بھی لغزش کے اسباب میں سے شمار کرتا ہے۔ سورہ نجم (آیت ۲۳) میں ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ۔

"وہ صرف گمان اور نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں"

۲۔ جلد بازی

ہر فیصلے اور اظہار نظر کے لئے کچھ دلائل اور دستاویزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جب تک کسی مسئلے کے متعلق کافی و وافی دلائل و مدارک اکٹھے نہ ہو جائیں اس وقت تک اس سلسلہ میں کسی بھی قسم کا اظہار نظر، جلد بازی اور افکار کی لغزش کا سبب ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے بے شمار مقامات پر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بعض فیصلوں کے بارے میں انسان کا علمی سرمایہ کم اور ناکافی ہے اس لئے اس نے ان معاملات میں اظہار حتم ویقین کو احتیاط کے خلاف قرار دیا ہے۔ مثلاً سورہ اسراء (آیت ۸۵) میں فرماتا ہے:۔

وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔

"یعنی جس قدر عرفان وآگہی تم کو ملی ہے وہ کم ہے اور فیصلہ کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔"

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "خداوند عالم نے قرآن مجید میں اپنے بندوں کے لئے دو آیتوں کو مخصوص کیا ہے اور تنبیہ کی ہے کہ ایک یہ کہ جب تک کسی چیز کے بارے میں علم ویقین حاصل نہ کریں اس کی تصدیق (میں جلد بازی) نہ کریں اور دوسرے یہ کہ جب تک کسی چیز کے بارے میں علم حاصل نہ کرلیں، جب تک علم ویقین کے مرحلہ تک نہ پہنچ جائیں اس کا انکار (کرنے میں جلد بازی) نہ کریں۔

خداوند عالم ایک آیت میں ارشاد فرماتا ہے:

أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِيثَاقُ الْكِتَابِ أَنْ لَا يَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ [1]

کیا ان سے کتاب (کتاب فطرت یا آسمانی کتابوں) میں یہ عہد نہیں لیا گیا ہے کہ وہ خداوند عالم کی طرف اسکے علاوہ کسی اور چیز کی نسبت نہ دیں جو چیز حق ہے (اس کا حق ہونا ثابت ہو چکا ہے)

ایک دوسری آیت میں ارشاد فرمایا ہے :-

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ [2]

انہوں نے اس چیز کا انکار کیا اور جھٹلایا جس کے علم پر ان کا احاطہ نہیں تھا (اور اس کو نہیں پہچانتے تھے) [3]

۴۔ قدامت پسندی

انسان اپنی طبع اول کے زیر اثر جب یہ دیکھتا ہے کہ فلاں فکر و عقیدہ کو گزشتہ نسلیں مانتی تھیں تو وہ خود بخود تحقیق کئے بغیر اس کو قبول کر لیتا ہے۔ قرآن یاد دہانی کراتا ہے کہ اسلاف کے عقائد کو جب تک عقل کی ترازو پر خوب اچھی طرح تول نہ لو، قبول نہ کرو، اسلاف کے عقائد کے مقابلہ میں فکری استقلال سے کام لو۔ سورہ بقرہ آیت ۱۷۰ میں ارشاد ہوتا ہے :-

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خداوند عالم نے وحی کے ذریعے نازل کیا ہے اس کی اطاعت کرو تو کہتے ہیں، نہیں ہم اسی عقائد اور رسم و رواج کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا

---

[1] اعراف ۱۶۹۔ [2] یونس ۳۹۔

[3] تفسیر المیزان۔ جلد ۶ صفحہ ۳۱۹۔ سورہ اعراف آیت ۱۶۹ کے ذیل میں۔

ہے، کیا اگر ان کے آباء واجداد نہ کچھ سمجھتے تھے اور نہ سیدھے راستہ پر تھے۔ پھر بھی یہ ان ہی کی پیروی کریں گے ؟!

۵۔ شخصیّت پرستی

فکری لغزشوں کا ایک اور سبب شخصیت پرستی ہے۔ تاریخی یا معاصر عظیم شخصیتیں چونکہ دلوں میں عظمت رکھتی ہیں اس لئے وہ دوسروں کے ارادے، عزائم اور افکار پر اثر انداز ہوتی ہیں اور درحقیقت وہ دوسروں کے ارادوں اور افکار کو مسخر کر لیتی ہیں۔ دوسرے لوگ اسی طرح سوچنے لگتے ہیں جس طرح سے وہ عظیم شخصیتیں سوچتی ہیں۔ انہی چیزوں کا عزم کرتے ہیں جن کا عزم یہ شخصیتیں کرتی ہیں۔ ان کے سامنے دوسرے لوگ اپنے ارادہ اور فکری استقلال سے محروم ہو جاتے ہیں۔

قرآن حکیم ہم لوگوں کو فکری استقلال کی دعوت دیتا ہے اور بڑی شخصیتوں کی اندھی تقلید کو ابدی شقاوت کا باعث سمجھتا ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی زبان سے جو اس طریقہ سے گمراہ ہو گئے ہیں، نقل کرتا ہے کہ وہ قیامت کے دن کہیں گے :۔

رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا (احزاب ۶۷)

اسلام میں تفکّر کے سرچشمے

قرآن جو کہ تفکّر و تعقل کی دعوت دیتا ہے افکار کی لغزش کے راستوں کو بتانے کے علاوہ تفکّر کے سرچشموں کی بھی نشاندہی کرتا ہے، یعنی ان موضوعات کو بھی بتاتا ہے جو اس بات کی شائستگی رکھتے ہیں کہ انسان ان موضوعات کے بارے میں فکر کرے اور ان سے اپنے عرفان و آگہی کے سرچشموں کے طور پر فائدہ اٹھائے۔

کلّی طور پر اسلام میں ان مسائل کے بارے میں اپنی فکری طاقت کو صرف کرنے کی مخالفت کی گئی ہے

جس کا نتیجہ فکر کو تھکا دینے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے اور یہی علم ان مسائل کا ہے جن کے بارے میں تحقیق کرنا ممکن تو ہو لیکن اس سے انسان کو کوئی فائدہ نہ ہو۔

پیغمبر اکرمؐ نے اس علم کو عبث اور فضول قرار دیا ہے جس کے وجود سے کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو اور اس کے نہ ہونے سے کوئی نقصان بھی نہ ہوتا ہو لیکن وہ علوم جو قابلِ تحقیق بھی ہیں اور مفید بھی، اسلام ان کی پرزور تائید کرتا ہے اور لوگوں کو انکی جانب رغبت دلاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم مفید اور سودمند فکر کے لئے جن موضوعات کی نشاندہی کرتا ہے[1] ان میں سے تین اہم موضوعات یہ ہیں:۔

۱۔ طبیعت

پورے قرآن میں اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن میں طبیعت یعنی زمین، آسمان، ستارے، سورج، چاند، بادل، بارش، ہوا کا چلنا، سمندروں میں کشتیوں کا چلنا، نباتات، حیوانات اور آخر کار ہر اس محسوس چیز کو جس کو انسان اپنے اردگرد دیکھتا ہے، ایسے موضوعات کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے جس کے بارے میں پوری توجہ کے ساتھ غور و فکر اور تحقیق نیز اس سے نتیجہ حاصل کرنا چاہئے، بطور نمونہ ایک آیت ذکر کرتے ہیں:۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (یونس ۱۰۱)

لوگوں سے کہدو کہ غور و فکر کریں اور دیکھیں کہ آسمانوں اور زمینوں میں کیسی کیسی چیزیں ہیں؟

۲۔ تاریخ

قرآن میں بہت سی آیتیں ہیں جو گزشتہ اقوام کے حالات کو مطالعہ کرنے کی دعوت دیتی ہیں، اور اس

---

[1] رسالہ "شناخت در قرآن" میں جس کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں۔ اور انشاءاللہ عنقریب شائع ہو جائیگا۔ معرفت کے موضوعات اور ماخذ پر تفصیلی بحث کی ہے۔

کو کسب علم کے ایک سرچشمہ کے طور پر متعارف کرواتی ہیں۔ قرآن کی نظر میں انسان کی تاریخ اور اس کے تحولات کچھ قوانین و نوامیس کے مطابق انجام پاتے ہیں۔ تاریخی عزت و ذلت، شکست و کامیابی، خوش نصیبی اور بدنصیبی بہت ہی صحیح اور منظم حساب و کتاب رکھتی ہے۔ ان قوانین اور حساب و کتاب کو سمجھ کر تاریخ حاضر کو اپنے قبضے میں کر کے خود اپنی اور دورِ حاضر کے لوگوں کی سعادت و خوش نصیبی کے لئے اس سے بہرہ مند ہوا جا سکتا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک آیت (آلِ عمران ۱۳۷) پیش خدمت ہے :-

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۔

یعنی تم سے پہلے کچھ سنتیں اور قوانین عملاً واقع ہو چکے ہیں اس لئے زمین کی سیر کرو اور ماضی کے تاریخی آثار کے سلسلے میں چھان بین کرو اور دیکھو کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو ان حقائق کو جھٹلاتے تھے جن کو میں نے وحی کے ذریعے ان کے پاس بھیجا تھا۔

۳۔ انسان کا ضمیر

قرآن انسان کے ضمیر کو معرفت کے ایک مخصوص سرچشمہ کے عنوان سے یاد کرتا ہے۔ قرآن کی نظر میں پورا عالم تخلیق الٰہی آیتیں اور حقیقت کے انکشاف کے لئے نشانیاں اور آیتیں ہیں۔ قرآن انسان کی بیرونی دنیا کو "آفاق" اور انسان کی داخلی دنیا کو "انفس" کے نام سے یاد کرتا ہے اور اس طرح سے انسانی ضمیر کی مخصوص اہمیت کے بارے میں ٹھوکے دیتا ہے۔ اسلامی ادب میں "آفاق اور انفس" کی اصطلاح یہیں سے نکلی ہے۔

یورپی فلسفی کانٹ کا ایک جملہ عالمی شہرت رکھتا ہے اور وہی جملہ اس کے سنگِ قبر پر کندہ ہے۔ وہ کہتا ہے :-

"دو چیزیں انسان کو حیرت میں ڈال دینے کے لئے کافی ہیں : ایک ستاروں بھرا آسمان جو ہمارے سروں پر جلوہ فگن ہے، دوسرے وہ ضمیر و وجدان جو ہمارے اندر موجود ہے۔"

مندرجات

صفحہ

انسان اور حیوان ۵

حیوانات کی خواہشات کی سطح اور ان کی معلومات کی وسعت۔ ۶

انسان کے عرفان و آگہی کی وسعت اور اس کی خواہشات کی سطح۔ ۸

انسان کے امتیاز کا معیار۔ ۹

انسانیت اصل ہے یا فرع۔ ۱۲

علم اور ایمان ۱۸

علم اور ایمان کا رابطہ۔ ۱۹

علم اور ایمان کی جانشینی۔ ۲۶

مذہبی ایمان۔ ۳۱

ایمان کے آثار اور فائدے۔ ۳۶

مکتبہ، آئیڈیالوجی، نظریہ ۴۶

اسلام ایک جامع اور ہمہ گیر مکتب۔ ۶۲

قرآن کے نقطۂ نظر سے فکری لغزش کے مقامات۔ ۶۳

اسلام میں تفکر کے سرچشمے۔ ۶۷

فتح انقلاب اسلامی کے جشن

تیسری سالگرہ کی انتظامیہ کمیٹی